اسلام کا اسمٰعیلی قالب

دین کا اسمٰعیلی قالب بظاہر آج حاشیہ پر نظر آتا ہے کہ نزاری اور مستعلی اسمٰعیلی اپنی قلت تعداد کے سبب عالمِ اسلام میں اب اس جاہ وحشمت کے حامل نہیں جس سے کبھی فاطمی خلافت عبارت تھی لیکن یہ بھی ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ فاطمی دعوت کے باقیات خواہ وہ دروزی، علوی اور نصیری فرقوں کی شکل میں عالم اسلام کے مختلف علاقوں میں پائے جاتے ہوں یا نزاری امام اور مستعلی داعیوں کی قیادت میں دنیا کے مختلف حصوں میں اپنے عظیم الشان ماضی سے آج بھی حظ حاصل کرتے ہوں، واقعہ یہ ہے کہ فاطمی دعوت کی فکری باقیات آج بھی جمہور مسلم فکر کا حصّہ ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہمارے انحرافِ فکری میں جن گروہوں نے سب سے زیادہ اپنا حصّہ ڈالا ہے ان میں فاطمی دعوت سرِ فہرست ہے، جس کے تفہیم وتجزیہ کے بغیر مقبولِ عام سنّی فکر کے نظری التباسات کی واقعی تفہیم ممکن نہیں۔

اسمٰعیلیت جس کی حیثیت آج جمہور مسلمانوں کے نزدیک اسلام کے اجنبی اور منحرف قالب سے کچھ زیادہ نہیں، اپنے ابتدائی ایام میں اس کی عوامی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ اسمٰعیلی داعیان اپنی حیرت انگیز سرعت کے ساتھ عالمِ اسلام کے عین قلب میں ایک عظیم الشان سلطنت کی بناڈالنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ فاطمی خلافت کی جاہ وحشم کے آگے خلافت عباسی کی تابانی بھی ماند پڑ گئی تھی۔ شمالی افریقہ سے بلادِ شام، یمن، حجاز، فلسطین، سسلی اور ادھر سندھ، ملتان اور افغانستان کے وسیع علاقوں پر ان کی حکومت قائم ہوگئی۔ سقوطِ قاہرہ کے بعد بھی کوئی ڈیڑھ سو سال تک قلعہ الموت اور بلادِ شام کے اسمٰعیلی داعی فارس کے مختلف قلعوں پر قابض رہے حتیٰ کہ منگولوں کے حملے کے بعد بھی جب آلِ عباس کی

حکومت کا خاتمہ ہوگیا نزاری اماموں نے بعض اسٹریٹجک قلعوں پر اپنا کنٹرول برقرار رکھا اور ان کے داعیوں کی خاموش سرگرمیاں مخالفین کی تمام تر ترک تازیوں کے باوجود جاری رہیں۔ اسمٰعیلی داعیوں نے اہل تصوف کا قالب اختیار کیا۔ سہروردیہ، قادریہ، چشتیہ اور نہ جانے کتنے سلسلے باطنی دعوت کی تنظیم کے لیے قائم کئے گئے۔ اہل صفا کے بھیس میں کوئی ملتان اور لاہور پہنچا تو کسی کو دہلی اور اجمیر کی ولایت پر مامور بتایا گیا۔ جتنی خاموشی، اخفائے راز اور جانفشانی سے ان اسمٰعیلی داعیوں نے مختلف اطراف واکناف میں دعوت کا فریضہ انجام دیا وہ یقیناً لائق ستائش ہے۔ گو کہ یہ سر دست ہماری تحقیق کا موضوع نہیں۔ ان زبردست کوششوں اور اولوالعزم مہم جوئیوں کے باوجود اسمٰعیلی داعیوں کو خلافت فاطمی کے احیاء کا موقع تو نہ مل سکا حتیٰ کہ آغا خان کی وہ درخواست بھی مسترد کر دی گئی جو انھوں نے حکومت برطانیہ کی وفاداری اور خدمت کے صلہ میں اس امید پر پیش کی تھی کہ غیر منقسم ہندوستان کے مختلف علاقوں مثلاً ممبئی، گجرات، چترال اور کراچی میں قابل ذکر اسمٰعیلی آبادی کے سبب تقسیم ہند کے موقع پر انھیں بھی ایک آزاد خطہ عطا کر دیا جائے۔ اسمٰعیلی دعوت کے سیاسی احیاء کی بیل تو منڈھے نہ چڑھ سکی البتہ صدیوں کی خفیہ اور اعلانیہ سرگرمیوں کے نتیجے میں اتنا ضرور ہوا کہ رفتہ رفتہ غیر محسوس طور پر سنی اسلام کے نظری چوکھٹے میں اسمٰعیلی التباسات نے اپنی مستقل جگہ بنالی۔ تفضیلِ علیؓ اور پنجتن پاک کا عقیدہ مقبولِ عام سنّی اسلام کے قالب میں در آیا۔ اہل تصوف کے فقہ باطن نے امت کے مجموعی مزاج کی تقلیب ماہیت کر ڈالا۔ شریعت کے مقابلہ میں طریقت اور اس سے ایک قدم اور آگے بڑھاتے ہوئے حقیقت کو غایت دین کا منتہاء و مقصود سمجھا جانے لگا۔ اسمٰعیلیت ہمارے مشترکہ فکری انحراف کی وہ بلند چوٹی ہے جسے سر کئے بغیر اس بات کا کچھ بھی اندازہ نہیں ہوسکتا کہ التباسات سے ماوراء، چوٹی کے اس پار، ہماری فکری سرزمین کل تک کتنی مختلف نظر آتی تھی۔

ابتداً فاطمی دعوت ایک تحریک انصاف سے عبارت تھی۔[۲۱۳] امویوں کے زوال کے بعد بجا طور پر یہ توقع کی جاتی تھی کہ الرضا من آلِ محمدؐ کے نعرے سے وقت کے امام عادل کا ظہور ہوگا۔ عباسی دعوت بنیادی طور پر ایک شیعی دعوت تھی جس کی نشر و اشاعت میں حلقۂ آلِ بیت کے ارادت مندوں نے اپنی ساری توانائی جھونک دی تھی۔ لیکن جب یہ دعوت ریاست کی شکل میں متشکل ہوئی تو لوگوں کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ امام المسلمین کے منصب پر سفاح اور منصور جیسے حضرات متمکن ہوگئے تھے۔ عام لوگوں کے لیے یہ نئی قیادت اس لیے بھی باعث حیرت تھی کہ ابتداء سے ہی دعوتِ عباسی کے نقباء نے امام کی شخصیت پر ابہام کا پردہ ڈال رکھا تھا۔[۲۱۴] امام ابراہیم جو مرکز سے دور خراسان کے علاقوں میں خفیہ طور پر اس دعوت کی کمان کر رہے تھے انھیں تو امام المسلمین بننے کا شرف حاصل نہ ہوسکا البتہ حالات کی غیر متوقع سبک رفتاری نے ان کے بھائی سفاح کو اس منصبِ عالی مقام پر متمکن کر دیا۔

اس میں شبہ نہیں کہ عہد عباسی کی ابتداء تک آلِ بیت ایک ڈھیلا ڈھالا تصور تھا جس میں علوی خانوادوں کے علاوہ رسول اللہ کے دوسرے ہاشمی اقارب بھی شامل سمجھے جاتے تھے لیکن یہ بات بھی اپنی جگہ حقیقت ہے کہ علوی خانوادے سے اٹھنے والی کیسانیہ تحریک اور پھر شہادت حسینؓ کے المناک سانحہ کے سبب اولادِ علیؓ کو اس حوالے سے خصوصی اہمیت حاصل ہوگئی تھی۔ عہد اموی میں توّابون کی تحریک نے جو گرد اٹھائی تھی اس نے نہ صرف یہ کہ علوی خانوادے کے سلسلے میں عمومی ہمدردی کی فضا پیدا کردی تھی بلکہ بعض حلقے سیادت پر ان کے استحقاق کو ایک فطری وظیفے کے طور پر دیکھنے لگے تھے۔ ذرا غور کیجئے حسینؓ جب کوفہ کو چلے ہیں تو ان کے ساتھ عزیز و اقارب پر مشتمل محض بہتر لوگوں کا قافلہ تھا۔ اموی سلطنت کے آخری ایام تک سماجی منظرنامہ اتنا بدل گیا کہ تفضیلِ علیؓ کی روایتوں کے سبب حضرت علیؓ کو وصی رسولؐ کی حیثیت سے دیکھا جانا بعض حلقوں میں صلابت فکری کا حصہ سمجھا جانے لگا۔ اس نظری اور فکری ماحول میں الرضا من آلِ محمدؐ کے بطن سے سفاح و منصور کا ظہور بہتوں کے لیے قابل قبول نہیں ہوسکتا تھا۔ ابتداً دعوتِ عباسیہ کے نقیب اس خیال کی پرزور تبلیغ و اشاعت کرتے رہے کہ ابوہاشم (جو محمد بن حنفیہ کے خانوادے سے تھے) نے عباسی خانوادے کے محمد بن علی کو حق خلافت نص کردی تھی۔ یہ بھی کہا جاتا ہےکہ ابوہاشم کے حوالے سے دعوتِ عباسی کو بعض لوگ ہاشمیہ سے بھی موسوم کرتے تھے جس سے بسا اوقات یہ تاثر قائم ہوتا کہ ہاشمیت کی اس دعوت کا تعلق آلِ بیت کے ہاشمی اقارب سے ہے۔ الرضا من آل محمدؐ کی اصطلاح بھی اسی خیال سے وضع کی گئی تھی کہ اولاً امام کی شخصیت پر ابہام کا پردہ پڑا رہے۔ ثانیاً اس کے تعین کو اس وقت تک کے لیے مؤخر رکھا جائے جب تک دعوت حتمی کامیابی سے ہمکنار نہیں ہوتی۔ کہا جاتا ہے کہ اس سلسلے میں کسی موقع پر عباسی داعیوں نے جعفر الصادق کو اس منصب کی پیشکش بھی کی تھی جسے انھوں نے قبول کرنے سے انکار کردیا تھا۔[۲۱۵] آلِ عباس کے ظہور سے ایک بار پھر ایسا محسوس ہوا گویا منصبِ خلافت کے اصل سزاواروں کے ساتھ سخت دھوکہ ہوا ہے۔ آگے چل کر جب عباسی سلطنت مستحکم ہونے لگی تو خلیفہ المہدی کے عہد میں عباسیوں نے ابوہاشم کی منصوص امامت سے بھی ایک قدم اور آگے بڑھاتے ہوئے اس بات کا باضابطہ اعلان کردیا کہ رسول اللہ نے خلافت کا حق اپنے چچا عباس کو تفویض کیا تھا جن سے نسلاً بعد نسل یہ حق آلِ عباس کے موجودہ حکمرانوں کو حاصل ہوگیا ہے۔[۲۱۶] یہ تھا وہ سیاسی اور نظری پسِ منظر جس میں آلِ بیت کے بعض پرجوش داعیوں اور متبعین نے اسمٰعیلی یا فاطمی دعوت کا آغاز کیا۔

عباسی دعوت کی طرح فاطمی دعوت بھی ابتداً ایک زیرزمین انقلابی تحریک کے طور پر منظم ہوئی۔ امام کی شناخت کے اخفائے راز کا یہ عالم تھا کہ بقول عبیداللہ الشیعی جعفر الصادق کے بعد ہر امام نے اپنی شخصیت کو تراشیدہ ناموں کے پیچھے چھپا رکھا تھا۔ کوئی مبارک تھا تو کوئی میمون اور کسی کو سعید کا لقب دیا گیا تھا لیکن ان ناموں کے پیچھے کون لوگ تھے اس کا واقعی اندازہ کبار داعیوں کے علاوہ اور کسی کو نہ تھا۔[۲۱۷] تاریخی مصادر اس خیال کی تائید کرتے ہیں کہ ابتداً مرقد حسینؓ

کو حلقۂ آلِ بیت کی اس نئی دعوت کے مرکز کی حیثیت حاصل رہی۔ یمنی داعی علی بن الفضل جنھوں نے آگے چل کر اسمٰعیلی تحریک کو منظّم کرنے میں اہم رول ادا کیا، کربلا کی زیارت کے موقع پر ہی اس تحریک میں داخل ہوئے۔[۲۱۸] ان ہی علی بن فضل نے منصور الیمن ابن حوشب کے ساتھ مل کر یمن میں اسمٰعیلی تحریک کو کامیابی سے ہمکنار کیا۔ متوکل نے جب مرقد حسینؓ کو مسمار کرنے کا حکم جاری کیا تو اس کے پیچھے احیائے سنّت سے کہیں زیادہ اس زیرزمین تحریک کو کچلنے کا داعیہ کارفرما تھا۔ مرقد حسینؓ کی مسماری نے فاطمی دعوت کے لب ولہجہ کو نظری اور عملی ہر دو اعتبار سے متاثر کیا۔ اولاً اسمٰعیلی داعی محفوظ ٹھکانوں کی تلاش میں مرکز خلافت سے دور افریقہ کی سرزمین میں پناہ لینے پر مجبور ہوئے جہاں آلِ بیت کے لیے پہلے سے ہی وافر ہمدردی موجود تھی۔ نظری اعتبار سے آلِ بیت کا تصور ایک بار پھر نئی تشریح کا سزاوار قرار پایا۔[۲۱۹] اسمٰعیلیوں نے اس خیال کی پرزور تبلیغ کی کہ اہل بیت کہلانے کے واقعی مستحق صرف آلِ فاطمہؓ ہیں جنھیں منصوص ائمہ کی حیثیت حاصل ہے اور یہ کہ حضرت علیؓ کی حیثیت اساس الائمہ کی ہے۔ اسمٰعیلیوں کی اس نئی تاویل کے مطابق جعفر الصادق پانچویں امام منصوص قرار پائے جنھوں نے اسمٰعیل پر نص کی اور جن کے بیٹے محمد بن اسمٰعیل دشمنوں کے خوف سے چھپا دیئے گئے۔ ابتدا میں یہ خیال کیا جاتا تھا کہ محمد بن اسمٰعیل جو امام مستور ہیں جلد ہی مہدی کی حیثیت سے ظاہر ہوں گے اور پھر وہ قائم کی حیثیت سے اس نظامِ انصاف کو قائم کر دیں گے جو غایت دینِ نبویؐ ہے۔ بظاہر یہ ایک سیدھا سا سیاسی نظریہ تھا جس کا سمجھنا اور سمجھانا کچھ مشکل نہ تھا لیکن مصیبت یہ تھی کہ اسمٰعیلیوں کی خفیہ دعوت جس ماحول میں کام کر رہی تھی اور جس سرزمین میں اسے سب سے زیادہ برگ وبار لانے کا امکان تھا وہاں آلِ بیت کے حوالے سے غلاۃ کے مختلف نظریات کی گونج ابھی باقی تھی۔ مثال کے طور پر ابوالخطاب جو جعفر الصادق کے حلقۂ ارادت میں شامل تھے وہ پہلے شخص تھے جنھوں نے باقاعدہ ایک باطنی تحریک کی داغ بیل ڈالی۔ ابوالخطاب کے خیالات سے گوکہ خود جعفر الصادق کو اتفاق نہ تھا لیکن ان کے بیٹے اسمٰعیل ابوالخطاب کے ہمنوا تھے۔[۲۲۰] کہا جاتا ہے کہ ابوالخطاب نے ۱۳۸ھ میں رات کی تاریکی میں کوفہ کی مسجد میں اپنے ستّر حامیوں کو اس خیال سے جمع کیا کہ وہ ایک نئی صبح کے قیام کے لیے مناسب اقدام کا آغاز کریں۔ ابوالخطاب کی بغاوت کچلی گئی لیکن ان کے خون نے ایک ایسی باطنی تحریک کی بنیاد رکھ دی جو اس خیال کی حامل تھی کہ ہر دور میں خدا نے دو پیغمبر بھیجے ایک ناطق تھا اور دوسرا صامت اور یہ کہ محمد رسولؐ اللہ اپنے عہد کے پیغمبر ناطق تھے اور علیؓ کی حیثیت پیغمبر صامت کی تھی۔ ابولخطاب خود کو جعفر الصادق کا وصی بتاتے جن کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ انھیں اسم اللہ الاعظم کی معرفت حاصل ہے۔ ابوالخطاب کے متبعین قرآن مجید کی باطنی تاویل کی وکالت کرتے اور برملا اس خیال کا اظہار کرتے کہ ائمۂ منصوص نورِ خداوندی سرایت کیے جانے کے سبب ایک طرح کی تقدیس کے حامل ہیں۔[۲۲۱] خطابیہ کے اس طرزِ فکری نے اسمٰعیلی تحریک کے نظری خدوخال متعین کرنے میں اہم رول ادا کیا۔

غلاۃ کے حلقہ سے ایک اور نام جس نے اسمٰعیلی تحریک پر اپنے اثرات مرتسم کئے مخمصہ کا بھی ہے۔ بعض تذکرہ نگاروں نے اسے خطابیہ کا ہی دوسرا نام بتایا ہے۔ ان لوگوں کا عقیدہ تھا کہ محمدؐ فی نفسہٖ خدا ہیں جو ہمارے درمیان محمدؐ، علیؓ، فاطمہؓ، حسنؓ اور حسینؓ کی پانچ مختلف شکلوں میں ظاہر ہوئے۔[۲۲۲] ان حضرات کا یہ بھی خیال تھا کہ محمدؐ ہی کبھی آدمؑ، نوحؑ، ابراہیمؑ، موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کی شکل میں جلوہ گر ہوئے اور یہ کہ سلمان کی حیثیت محمدؐ کے باب کی ہے جو ظہور کے ہر دور میں محمدؐ کے ساتھ ظاہر ہوتے رہے ہیں۔ اس کے علاوہ علیائیہ یا البائیہ کے نام سے بشار الشرفی کے متبعین کا بھی ایک گروہ تھا جو محمدؐ کی تو نہیں البتہ علیؓ کی الوہیت کا قائل تھا، جس نے آگے چل کر نصیریت کی علیحدہ شکل اختیار کی۔[۲۲۳] کہا جاتا ہے کہ محمد بن نُصیر جنھوں نے نصیری فرقہ کی بنیاد رکھی ابتداً وہ اثناعشری سلسلہ کے دسویں امام کے متبعین تھے۔ یہ تھا وہ فکری ماحول جس میں اسمٰعیلی دعوت زیرِ زمین تحریک کی حیثیت سے نمو پذیر تھی۔ ابتداً مخالفین نے اس تحریک کو قرامطیہ[۲۲۴] کا نام دیا اور بعضوں کے نزدیک یہ لوگ سَبْعِیّہ سے ملقب ہوئے کہ ان کے عقیدے کے مطابق ساتویں امام محمد بن اسمٰعیل پر امامت منصوص کا سلسلہ ختم ہو جاتا تھا۔

جوں جوں اسمٰعیلی دعوت آگے بڑھتی گئی اسمٰعیلی داعیوں کو اپنے نظری فریم ورک میں شدت سے اصلاح کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔ ساتویں امام محمد بن اسمٰعیل کو القائم اور المہدی کے منصب پر فائز کئے دینے سے ان کے متبعین کے لیے انتظار کے علاوہ کوئی دوسرا متبادل نہیں رہ گیا تھا۔ صاحب الزماں کے غیاب کو عقیدہ کی حیثیت سے قبول کر لینے کا واضح مطلب تھا کہ اب ان کے ظہور تک تبدیلی کے سارے راستے بند ہو چکے ہیں۔ دوسری طرف اثناعشری شیعہ حلقوں میں بارہویں امام کے غیاب کو نظری طور پر تسلیم کیا جا چکا تھا۔ سو حلقۂ آلِ بیت کے متشدد ارادت مندوں کے لیے اس کے علاوہ اور کوئی چارۂ کار نہ رہا کہ وہ امامِ مستور کے چہرے سے تعبیرات کی سابقہ نقاب کھینچ پھینکیں۔[۲۲۵] ابو عبداللہ الشیعی کے ہاتھوں جب افریقہ میں دعوتِ فاطمی کو استحکام حاصل ہو گیا تو تاریخ کی سابقہ اسمٰعیلی تعبیریں رد کر دی گئیں۔ عبداللہ نے پہلے تو خلیفہ کی حیثیت سے بیعت لیا لیکن جلد ہی اپنے آپ کو مہدی کی حیثیت سے پیش کرنے کی ضرورت محسوس کی۔ افریقہ میں مہدی کے ظہور کی خبر نے عالم اسلام کے مختلف حصّوں میں آلِ بیت کے حلقوں میں غلغلہ انگیز کیفیت پیدا کر دی۔ یمن اور بحرین میں مہدیت کے مختلف دعویدار سامنے آ گئے۔[۲۲۶] فاطمی دعوت کی سیاسی کامیابی نے غلاۃ شیعہ کو ایک نئی تقلیدِ فکری سے ہی دو چار نہیں کیا بلکہ فاطمی دعوت تعبیر و تاویل کے مختلف مراحل سے گزرتی ہوئی امت کے مجموعی مزاج کی تشکیلِ نو کا اہم وسیلہ بن گئی۔

فاطمی دعوت امت کے اسی سیاسی انتشار اور فکری التباسات کی پیداوار تھی جس کے بطن سے اسلام کے مختلف متحارب شیعی، سنّی اور اباضی قالب وجود میں آئے تھے۔ چونکہ انھوں نے غلاۃ شیعہ کے مختلف گروہوں کو اپنی دعوت کی

تنظیم نو میں استعمال کیا تھا اس لیے ان کے ہاں فکری التباسات کی دھند دوسروں سے کہیں زیادہ دبیز نظر آتی تھی۔ یہ تو وہ قدرے معروضی تناظر ہے جو صدیوں زمانی اور مکانی بُعد کے سبب فی زمانہ ہمارے لیے اختیار کرنا ناممکن ہے۔ البتہ اس عہد میں جب عباسی خلافت مسلمانوں کی مجموعی وحدت کا علامیہ تھی اور عباسی خلفاء وارثِ رسولؐ کی حیثیت سے منصب خلافت کو اپنا مذہبی حق سمجھتے تھے۔ آلِ فاطمہ کے حلقہ سے خلافت کے نئے دعویداروں کا ظہور نظری اور سیاسی ہر دو سطح پر ایک نئے چیلنج سے عبارت تھا۔ عباسی حکومت نے فاطمیین کے حقِ خلافت کو پرشور اور بسا اوقات گمراہ کن پروپیگنڈے سے دبانے کی ہر ممکن کوشش کی۔ اسمٰعیلی خود اپنی دعوت کو الدعوۃ الھادیہ[۲۲۷] سے موسوم کرتے تھے جبکہ ان کے مخالفین انھیں ملاحدہ کہتے۔ کسی نے انھیں باطنی قرار دیا اور کسی نے انھیں قرامطیوں کی حیثیت سے دیکھا۔ اور جن لوگوں نے قدرے معتدل رویہ اختیار کیا انھوں نے اس دعوت کو اسمٰعیلیہ کہنے پر اکتفا کیا۔ عباسی خلفاء اور ان کے علماء و مفکرین نے اسمٰعیلیوں کے سلسلۂ نسب کے سلسلے میں سخت شبہات وارد کیے۔[۲۲۸] خلیفہ قادر باللہ نے ان کے نسب کے بطلان کے لئے ایک محضر تیار کیا جس پر اس عہد کے کبار سنّی اور شیعہ علماء سے دستخط لئے گئے۔[۲۲۹] ابن رزم اور البغدادی جیسے سنّی مورخین نے اس خیال کو اعتبار بخشا کہ فاطمی خلفاء کے نسب کے دعوے ناقابل اعتبار ہیں۔ یہ بات زبان زد خلائق ہوئی کہ عبداللہ بن میمون القداح دراصل ایک فارسی نژاد یہودی طالع آزما تھا جس نے اسلام کی اینٹ سے اینٹ بجا دینے کے لیے فاطمی دعوت کا سہارا لیا تھا۔[۲۳۰] کہا جاتا ہے کہ اسمٰعیلیوں کے خلاف نظری پروپیگنڈے کو استناد بخشنے کے لیے کتاب السیاسة جیسی کتابیں بھی منظر عام پر لائی گئیں جن کی تصنیف کا الزام اسمٰعیلی داعیوں کے سر ڈال دیا گیا۔[۲۳۱] یہودی پروٹوکول کی طرح اسمٰعیلیوں کی ملزومہ تصنیف کتاب السیاسة دراصل الحاد و بے دینی کا ایک منشور تھا جس کے سبب اسمٰعیلیوں کو مطعون کرنے کے لیے گویا ایک علمی بنیاد ہاتھ آ گئی تھی۔ آگے چل کر جب نزاری اسمٰعیلی، سلجوقی ترکوں سے لوہا لینے لگے تو نظام الملک کی ایماء پر عباسی خلافت نے ایک بار پھر اسمٰعیلیوں کے خلاف اپنے مخالفانہ پروپیگنڈے اور سب وشتم کا دہانہ کھول دیا۔ غزالی المستظہری لکھنے پر مامور ہوئے[۲۳۲] اور اسی دوران نظام الملک تاریخ کے سب سے پہلے اسمٰعیلی فدائی ابوطاہر الرانی کے قاتلانہ حملے کا شکار ہو گئے۔[۲۳۳] ایک طرف اسمٰعیلیوں کو عباسی اور امامی مخالفانہ پروپیگنڈے کا سامنا تھا تو دوسری طرف ان کے صلیبی مخالفین نے انھیں اساسین کے بجائے— جیسا کہ نبی اور وصی کے حوالے سے وہ دو قائدین کی امت کہے جاتے تھے اور جس کے سبب انھیں اساسین کے نام سے متہم کیا جاتا تھا، Assasin یا حشیشی قرار دے ڈالا۔[۲۳۴] پروپیگنڈے اور جوابی پروپیگنڈے کے اس ماحول میں کسی سنجیدہ اور معروضی علمی مطالعہ کی گنجائش کم ہی رہ گئی تھی۔ اس پر مستزاد اسمٰعیلی داعیوں کی وہ غیر علمی روش تھی جس کے زیر اثر وہ اسرار حقیقت کی تعلیم تو کجا دعوت کی عام کتابوں کو بھی مخالفین کی نظروں سے بچائے رکھنا اسٹریٹجی کا حصّہ سمجھتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ

اسمٰعیلیت کا سنّی مطالعہ بڑی حد تک یک رخا ہو کر رہ گیا۔ ہم اسے ملحدین کی ایک ایسی تحریک پر محمول کرتے رہے جس کی بنیادیں ہماری نظری سرحدوں سے باہر پائی جاتی ہوں۔ اس زعم باطل نے ہمیں اس کا موقع کم ہی دیا کہ ہم اسمٰعیلی دعوت کے واقعی اسرار و عواقب کا اندازہ لگاتے اور اس تحلیل و تجزیہ کی ضرورت محسوس کرتے کہ عالمِ اسلام کے عین قلب میں ظاہر ہونے والی الدعوۃ الھادیہ کے نقیب آخر کس طرح ایک متبادل خلافت کے قیام میں کامیاب ہو گئے اور پھر جب اس کی باقیات ہمارے جسدِ ملّی میں رفتہ رفتہ تحلیل ہو گئی تو ہماری تقلیب ماہیت میں اس نے کتنا اہم رول انجام دیا۔ اسمٰلیت کا اس کے اصل ماخذ کی روشنی میں مطالعہ ہمارے لیے صرف اصل اسمٰعیلی تناظر سے آگہی کا باعث نہیں ہوگا بلکہ سنّی اسلام کے تحلیل و تجزیہ کے دوران ہم کہیں باخبری کے ساتھ اس بات کا اندازہ لگا سکیں گے کہ ہم صدیوں سے جس فرقہ کو ملاحدۃ سے متہم کرتے رہے ہیں اس کے التباساتِ فکری نے ہمارے دل و دماغ کی تشکیل میں کتنا خاموش اور کتنا مؤثر رول انجام دیا ہے۔

آیئے سب سے پہلے اسمٰعیلی ماخذ کی روشنی میں ہم اس سوال کی تحقیق کریں کہ مسئلہ خلافت کا سنّی اور اثنا عشری موقف اسمٰعیلی علماء کے لیے اگر نا قابل قبول رہا ہے تو آخر ایسا کیوں؟

مسئلہ ولایۃ

اسمٰعیلی یا فاطمی اسلام اس خیال سے عبارت ہے کہ امام وقت کی معرفت کے بغیر ایمان کی تکمیل نہیں ہو سکتی۔ ان کے ہاں ولایۃ دین کا رکنِ رکین ہے کہ مَـنْ ماتَ وَلَمْ یعرِفُ امام زَمَانِهٖ ماتَ مَیْتة جاھِلِیَۃ۔[۲۳۵] بعض روایتوں میں امام زمانہ کے بعد لفظ حیّا کا اضافہ ہے یعنی جس شخص کو اپنے زمانے کے زندہ امام کی معرفت حاصل نہ ہو وہ دراصل جاہلیت کی موت مرتا ہے۔[۲۳۶] کہا جاتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت علیؓ کی والدہ کی تدفین کے بعد کچھ دیر قبر کے سرہانے بیٹھ کر کچھ سنتے رہے پھر اچانک فرمایا ''تیرا بیٹا تیرا بیٹا، نہیں نہیں، علیؓ علیؓ۔'' واپسی پر لوگوں کے استفسار پر آپؐ نے بتایا کہ تدفین کے بعد مرحومہ کی قبر میں دو فرشتے آئے تھے جو ان سے ان کے رب، نبی اور امام کے بارے میں پوچھتے تھے۔ پہلے دو سوالوں کا جواب تو انھوں نے بآسانی دے دیا البتہ اس سوال پر کہ تمہارے امام کون ہیں؟ جب آپ کچھ نہ کہہ سکیں تو میں نے ان سے بتایا کہ تیرا بیٹا تیرا بیٹا یہ سن کر انھوں نے فرمایا عقیل عقیل میں نے کہا نہیں نہیں، علیؓ علیؓ۔[۲۳۷] امام کی معرفت مدارِ نجات کیوں نہ ہو جبکہ اسمٰعیلی علماء کی متداول کتابیں بآسالیبِ مختلف اس خیال کی توثیق کرتی ہوں کہ رسالۂ محمدی کا واحد اور مکمل وثیقہ قرآن مجید نہیں ہے بلکہ رسولؐ اللہ کے ہاتھوں ائمہ کو ایک اور کتاب العلم بھی دی

گئی ہے۔[۲۳۸] سو جن لوگوں کو امام کی معرفت حاصل نہ ہو ان کا ایمان کیسے مکمل ہوسکتا ہے۔ جو لوگ اپنے ائمہ کو قرآن مجید کے علاوہ کتاب العلم کا وارث سمجھتے ہوں ان کے لیے یقیناً اس منصب مامور پر ائمہ منصوص کے علاوہ کسی اور شخص کو قبول کیے لینے کی کوئی گنجائش نہیں ہوسکتی۔

اسمٰعیلی شیعہ ہوں یا اثنا عشری تبعین، امامت پر اپنے موقف کے سبب وہ خود کو عام مسلمانوں سے ایک درجہ افضل سمجھتے ہیں۔ صدیوں سے یہ بات ان کے دل و دماغ میں رچ بس گئی ہے کہ آپؐ کی وفات کے بعد جب مسلمانوں کی اکثریت نے وصیِ رسولؐ کا ساتھ چھوڑ دیا، جب جمل اور صفین کی خانہ جنگیوں میں جناب امیرؓ کو اپنوں کی تکلیف دہ مخالفت کا سامنا کرنا پڑا اور جب آگے چل کر کربلا میں نواسۂ رسولؐ کی شہادت کا المناک واقعہ پیش آیا، ان تمام عرصے میں ہم شیعوں نے آلِ بیتِ رسولؐ سے اپنی وفاداری نبھائی بلکہ اموی اور عباسی حکمرانوں کے خلاف آلِ بیت کی قیادت میں ہونے والے مختلف خروج میں ہم ان کے شانہ بہ شانہ لڑتے رہے۔ آلِ بیت سے اس تعلق خاص کے سبب محبانِ آلِ بیت خود کو اسلمنا کے بجائے آمنا کا مستحق قرار دیتے رہے ہیں[۲۳۹] اور اسی رعایت سے انھوں نے عام مسلمانوں کے مقابلے میں اپنے لیے مسلم کے بجائے مومن کی اصطلاح مختص کر رکھی ہے۔ ایسا اس لیے کہ ان کے ہاں ولایۃ جزو ایمان ہے سو جو لوگ علیؓ کی ولایۃ کے انکاری ہوں انھیں یہ تو کہا جاسکتا ہے کہ وہ مطیع ہوگئے یعنی اسلام لے آئے نہ یہ کہ وہ ایمان لے آئے۔ بقول قاضی النعمان ایک شخص مسلم ہوسکتا ہے لیکن ضروری نہیں کہ وہ مومن بھی ہو۔ وہ تمام لوگ جو غدیرِ خم میں ولایۃ علیؓ کی تنصیب کے انکاری ہیں اور جنھیں اسمٰعیلی علماء عامّہ پر محمول کرتے ہیں، ان کی نظر میں اسی درجے کے مسلمان ہیں۔ اسمٰعیلی نقطۂ نظر کے مطابق ولایۃ عمل منصوص ہے۔ غدیرِ خم میں رسولؐ اللہ کا یہ فرمانا کہ مَنُ کنت مولی فھذا علی مولیٰ اس بات کی دلیل ہے کہ اس نازک مسئلہ کو لوگوں کی ایماء یا ان کی مشاورت پر نہیں چھوڑا جا سکتا۔[۲۴۰] جو لوگ رسولؐ اللہ کی آخری علالت کے دوران ابوبکرؓ کی امامت میں نمازوں کے انعقاد کو نیابت رسولؐ کے لیے اشارہ سمجھتے ہیں اور جو یہ سمجھتے ہیں کہ جو شخص رسولؐ کی ایما پر نمازوں کی قیادت پر مامور ہوا ہو اسے زکوٰۃ کی وصولی کا بھی حق ہے تو یہ بات بوجوہ اسمٰعیلیوں کے نزدیک قابلِ قبول نہیں۔ بقول قاضی النعمان یہ عامّہ کا نقطۂ نظر ہے جو اس موقف کی تبلیغ سے بھی باز نہیں آتے کہ تم پر ایک حبشی غلام بھی مسلط ہو جائے تو اس کی اتباع کرو خواہ وہ معصیت کا ہی مرتکب کیوں نہ ہو۔[۲۴۱] قاضی النعمان کہتے ہیں کہ ابوبکرؓ کے حوالے سے جو لوگ اشارۂ رسولؐ کی بات کرتے ہیں وہ آخر اس حقیقت کو کیوں بھول جاتے ہیں کہ ابوبکرؓ کے سلسلہ میں تو آپؐ کا صرف اشارہ موجود ہے جبکہ علیؓ کو امامت باقاعدہ تفویض ہوئی اور علی الاعلان غدیرِ خم میں اس کی تنصیب عمل میں آئی۔ اسمٰعیلی علماء سنّیوں کے اس موقف کو بھی تسلیم نہیں کرتے کہ ابوبکرؓ کی امامت مسلمانوں کی باہمی مشاورت یا اجماع کے نتیجے میں منعقد ہوئی۔ ان کا کہنا ہے کہ امامت جیسا مسئلہ جس کا

تعلق ایمان اور عقیدے سے ہو عام لوگوں کی ایماء پر نہیں چھوڑا جا سکتا۔ امام کا مقام اس سے کہیں بلند تر ہے کہ جمہور عوام یا اہل الرائے اسے منتخب کریں۔ لوگوں کا کام امام کا اتباع کرنا ہے نہ کہ ان کا انتخاب۔ رہا یہ دعویٰ کہ ابوبکرؓ کی خلافت پر اجماع ہو چکا تھا تو تاریخ اس کی تصدیق نہیں کرتی کہ انصار کے بیشتر اصحاب اور صحابہ کرامؓ کی ایک بڑی تعداد ابوبکرؓ کی خلافت پر متفق نہ تھی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مدینہ سے باہر کے مسلمانوں کو تو اس انتخاب میں حصّہ لینے کا موقع ہی نہ ملا تھا۔ پھر سنّیوں کے امام الائمہ الاشعری کا اس مسئلہ پر اجماع کا دعویٰ کرنا اور لا تجمع امتی علی الضلالۃ سے دلیل لانا کہاں تک حق بجانب ہے؟[۲۴۲] قاضی النعمان کہتے ہیں کہ سنّیوں کا یہ الزام کہ ہم شیعوں نے علیؓ کو منصب امامت پر بٹھا کر بدعت کا ارتکاب کیا ہے تو انھیں یہ جان لینا چاہیے کہ اولاً ولایۃ ایمان کا حصّہ ہے۔[۲۴۳] امام کو شریعت کی تشریح و تعبیر کا کلی حق حاصل ہے اور یہ صرف اسی کا حق ہے۔ اس کے برعکس جن لوگوں نے تشریح و تعبیر اور رشد و ہدایت کے منصب پر فقہاء و علماء کو بٹھا رکھا ہے تو اس کے لیے ان کے پاس کیا دلیل ہے؟

سنّی تصورِ امامت کی نکیر کرتے ہوئے قاضی النعمان نے تاریخ سے بھی چند مثالیں پیش کی ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر تنصیبِ خلافت کے لیے مشاورت ہی صحیح طریقہ کار ہے جس سے ابوبکرؓ کی خلافت پر دلیل لائی جاتی ہے، تو پھر اس کسوٹی پر عمرؓ کی خلافت پوری نہیں اترتی کہ انھیں راست ابوبکرؓ نے نامزد کیا تھا۔ اور جب عمر کا وقتِ رخصت آیا تو انھوں نے ان پہلے دو طریقوں کا بھی پاس نہ کیا بلکہ خلافت کو چھ لوگوں کی کمیٹی میں محدود کر دیا۔ اب رہی یہ بات کہ اگر محض کسی کو نماز کا امام بنائے جانے سے خلافت پر اس کی استحقاق کا اشارہ برآمد ہوتا ہے تو، قاضی النعمان پوچھتے ہیں کہ، عامۃ (سنّیوں) کے پاس اس کا کیا جواب ہے کہ عمرؓ نے صہیبؓ کو ایامِ شوریٰ کے دوران امامت کی ذمہ داری تفویض کی تھی۔ علالتِ رسولؐ کے دوران اگر علیؓ کو نماز کی امامت نہ سونپی گئی تو اس کی وجہ بقول قاضی النعمان یہ تھی کہ علالت کے ان ایام میں علیؓ آپؐ کی نگہداشت اور تیمارداری میں مصروف تھے۔ نعمان کہتے ہیں کہ علیؓ وہ واحد صحابی ہیں جنھوں نے عین حیاتِ رسولؐ میں رسولؐ کے علاوہ کسی اور کی اتباع میں نماز نہ پڑھی جبکہ ابوبکرؓ اور عمرؓ کا جنگ سلاسل کے دوران عمرو بن عاصؓ اور اسامہ بن زیدؓ کی امامت میں نماز کی ادائیگی کی بات تاریخ میں محفوظ ہے۔ نماز کی امامت کو منصب خلافت کا اشارہ سمجھنا یا اس واقعہ سے ابوبکرؓ کی خلافت پر دلیل قائم کرنا عامۃ کو یوں بھی زیب نہیں دیتا کہ وہ تو کسی بھی شخص کے پیچھے نماز پڑھنے کے قائل ہیں خواہ وہ عاصی ہو یا متقی۔ پھر وہ نماز کی امامت سے اس شخص کی فضیلت پر کیسے دلیل لا سکتے ہیں؟ اسمٰعیلی نقطۂ نظر کے مطابق امام کے احکام کی بجا آوری خدا اور رسولؐ کے احکام بجا لانے کے مترادف ہے۔ گویا امام منصب رسالت کا ہی توسیعہ ہے اگر ہم امام کو اپنی صوابدید اور باہمی مشاورت سے منتخب کر سکتے ہیں تو رسول کے انتخاب میں بھی ہمیں کوئی تکلف نہ ہونا چاہئے۔

یہ تو تھی خلافت کے سنّی موقف پر اسمٰعیلی علماء کی تنقید۔ اب ذرا اثناعشری موقف سے ان کے اختلاف کی نوعیت بھی ملاحظہ کیجئے۔ اسمٰعیلی عقیدے کے مطابق جعفر صادقؒ نے اسمٰعیل کو امامت نص کی تھی جو آپ کی زندگی میں ہی وفات پا گئے۔ اسمٰعیلؒ کے بعد امامت کا یہ حق ان کے بیٹے محمدؒ کو منتقل ہو گیا جنھیں دشمنوں کے خوف سے مستور ہونا پڑا۔ اثناعشری کہتے ہیں کہ اسمٰعیل کی موت کے بعد جعفر الصادقؒ نے خود اپنی زندگی میں امامت کا یہ حق موسیٰ کاظمؒ کو تفویض کر دیا تھا یا شیعہ اصطلاح کے مطابق ان پر نص کر دی تھی جس کے بعد امامت کا یہ سلسلہ ان ہی کی اولاد میں چلتا رہا تا آنکہ بارہویں امام نے غیبت اختیار کی۔ اسمٰعیلی کہتے ہیں کہ اثناعشریوں کا موقف اس لیے کمزور ہے کہ امامت خدا کی طرف سے تفویض کردہ امر ہے۔ جب ایک بار یہ اسمٰعیلؒ کے حوالے ہو گئی تو پھر یہ ان سے لوٹائی نہیں جا سکتی کجا کہ یہ کسی اور کے حوالے کی جائے۔ خدا یقیناً اس بات سے ناواقف نہ تھا کہ جعفر الصادقؒ کی زندگی میں ہی اسمٰعیلؒ وفات پا جائیں گے۔ اس کے باوجود انھیں اگر امامت تفویض ہوئی تو یہ بات اس خیال کی صداقت پر دال ہے کہ اسمٰعیلؒ کے بعد ان کی اولاد میں یہ سلسلہ آگے کو چلے۔ اپنے موقف کی صداقت پر اسمٰعیلی اس حدیث سے بھی دلیل لاتے ہیں لا تجتمع الامامة فی الاخوین بعد الحسنؓ والحسینؓ۔ یہ بھی کہا گیا کہ اسمٰعیلؒ کو نسب کے اعتبار سے بھی موسیٰ کاظمؒ پر ایک درجہ فوقیت حاصل ہے کہ اسمٰعیلؒ کی ماں فاطمہ، حسنؓ بن علیؓ کی پوتی تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ جب تک وہ حیات سے رہیں جعفر الصادقؒ نے دوسری شادی نہیں کی جبکہ موسیٰ کاظم ایک کنیز حمیدہ کے بطن سے تھے۔ اس کے علاوہ اسمٰعیل جہاں امامِ سیف تھے جن کی حکومت مخالف سرگرمیوں کے لیے منصور کے دربار میں طلبی تاریخ کا مشہور واقعہ ہے،[۲۴۴] جبکہ موسیٰ کاظم نے یا اثنا عشریوں کے دوسرے ائمہ نے نظامِ عدل کے قیام کے لیے کبھی تلوار نہیں اٹھائی۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ اسمٰعیلؒ کی اس منصوص امامت کو جعفر الصادقؒ کی طرف لوٹنے اور پھر اسے موسیٰ کاظم کو عطا کیے جانے کو برحق تسلیم کر لیا جائے۔ رہا اثنا عشریوں کا یہ موقف کہ بدأ اللہ فی اسماعیل مالم یبدلہ فی احد تو یہ خیال اس لیے لائق استناد نہیں کہ خود جعفر الصادقؒ سے یہ حدیث مروی ہے کہ ان البدا والمشیة للہ فی کل شیء الا الامامة۔[۲۴۵] یعنی اللہ تعالیٰ کی مشیت کو ہر چیز میں دخل ہے سوائے مسئلۂ امامت کے جہاں اس کی مشیت کو کوئی دخل نہیں۔

تاریخ اور مذہب کے ایک طالب علم کے لیے مسئلۂ امامت پر غور و فکر کے یہ مختلف انداز اور تعبیر و تشریح کے یہ مختلف تناظر دلچسپ بھی ہیں اور حیرت انگیز بھی۔ ان مختلف اور متحارب نقاطِ نظر سے اس بات کا اندازہ لگانا چنداں دشوار نہیں کہ جن امور کو سنّی، شیعہ، اسمٰعیلی اور دوسرے فرقے اساسِ ایمان قرار دیئے بیٹھے ہیں اور جن کی بنیاد پر دین کے مختلف قالب وجود میں آ گئے ہیں ان پر شرع اور عقل سے دلیل قائم کرنا ممکن نہیں۔ ایک گروہ جس دلیل کو برہانِ قاطع سمجھتا ہے دوسرے کے نزدیک سرے سے وہ دلیل لائق اعتناء ہی نہیں۔ اپنے موقف کو احق ثابت کرنے کے لیے ہم

خدا کے سلسلے میں بدا کے قائل ہو گئے اور پھر اس خیال کی تردید کے لیے اہل ایمان کی زبانوں سے اس قسم کے جسارت آمیز الفاظ بھی سنائی دینے لگے کہ قضیۂ امامت میں خدا کی مشیت بے بس ہے۔

امامت کو اساس دین اور اسے تکمیل ایمان کا لازمہ باور کرانے کے بعد ایک سیاسی فریق کی حیثیت سے فاطمی دعوت کے حاملین کے سامنے یہ سوال بھی پیدا ہوتا تھا کہ آخر خلافت کے دوسرے دعویداروں کے مقابلے میں ان کا وجہ امتیاز کیا ہو۔ ہم اس بات کی طرف پہلے ہی اشارہ کر چکے ہیں کہ عہد عباسی کی ابتدائی صدیوں میں آلِ بیت ایک ڈھیلا ڈھالا تصور تھا جس میں آلِ عباس کو بھی شامل سمجھا جاتا تھا۔ فاطمی دعوت کے زیر اثر آلِ بیت کا یہ تصور رفتہ رفتہ اتنا بدل گیا کہ آلِ فاطمہؓ کے علاوہ رسول اللہؐ کے دوسرے اقارب اس دائرے سے باہر ہو گئے۔ آلِ عباس پر ہی کیا موقوف فاطمی داعیوں نے محمد الحنفیہ کو بھی اس شجرۂ معصومین کی فہرست سے خارج کر دیا۔ حتیٰ کہ امام حسنؓ کی اولادوں کے لیے بھی امامت کے اس شجرہ میں کوئی گنجائش باقی نہ رہی۔ اسمٰعیلی داعیوں نے اپنی زیر زمین دعوت میں اس خیال کی پرزور تبلیغ شروع کر دی کہ محمدؐ رسول اللہ کو صرف ظاہری شریعت عطا ہوئی تھی جس کا باطن یا تاویل کا علم مولیٰ علیؓ کو عطا ہوا تھا جن کی حیثیت اساس کی ہے۔ آپؓ کے بعد چھ امام حسنؓ، حسینؓ، علیؓ زین العابدین، محمد الباقرؒ، جعفر الصادقؒ اور اسمٰعیلؒ باطنی تعلیم کی تکمیل کے لیے مامور ہوئے۔ ساتویں امام محمد بن اسمٰعیلؒ خاتم الائمہ، سابع الرسل اور سابع النطقاء کے ذریعے خدا نے شریعتِ محمدی کے ظاہر کو معطل کر دیا۔[۲۴۶] آپ کی نسل سے قیامت تک جو ائمہ ہوں گے وہ سب قائم کے خلفاء کی حیثیت سے دعوت کے فرائض انجام دیں گے۔ گویا محمد بن اسمٰعیل کا ظہور اس بات سے عبارت ہے کہ اب دینِ محمدیؐ کا ظاہری دور اپنے اختتام کو پہنچا اور باطنی دور کی ابتدا ہو گئی[۲۴۷] اور چونکہ باطن کے اسرار و رموز سے خلفائے قائم کے علاوہ کوئی اور واقف نہیں ہو سکتا اس لیے اہل ایمان کے لیے اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں کہ وہ خود کو ان خلفائے قائم کی بیعت میں دے دیں۔ مذہب کی زبان میں اس سیاسی پروپیگنڈے کو کچھ اس طرح بیان کیا گیا: رسول اللہ صلعم جاء بکلمة الاخلاص و امیر المؤمنین جاء بمعناه فلا وصول الی الاول و الاخر الابهما فلا جل ذلك قال علیؑ "انا الاول و الاخر"۔[۲۴۳] (رسول اللہؐ صلعم کلمۂ اخلاص لائے اور امیر المومنین علیؑ نے اس کے معنی بیان کئے۔ اول و آخر کی طرف ہم نہیں پہنچ سکتے مگر ان دونوں ہی کے سہارے سے۔ اسی لیے مولی علی نے فرمایا "انا الاول و الاخر")

اس نقطہ نظر کے مطابق امامت پر آلِ فاطمہؓ کا حق صرف اس لیے نہیں کہ وہ اس منصب پر منصوص و مامور ہیں بلکہ ازل سے ہی ظاہری اور باطنی دعوت کا سلسلہ انبیاء اور مستقر اماموں کی شکل میں چلا آتا ہے۔ حضرت عیسیٰؑ کے دور میں عبدالمطلب کی حیثیت مستقر امام کی تھی جن کی ذات میں نبوت، رسالت، وصایت اور امامت چاروں مراتب کا ارتکاز ہو گیا تھا۔ آپ نے اپنے بیٹے عبداللہ کو نبوت و رسالت کی ذمہ داری دے کر ظاہری دعوت کا صدر بنایا جبکہ

دوسرے بیٹے ابوطالب کو وصایت اور امامت سے سرفراز فرما کر باطنی دعوت کا امام مقرر کیا۔[۲۴۹] عبداللہ سے نبوت و رسالت کا فرضِ منصبی محمد رسولؐ اللہ کو ودیعت ہوا جبکہ باطنی دعوت کی جانشینی علیؑ کے حصّہ میں آئی۔ اب چونکہ مولی علیؑ کی موجودگی میں آپؐ کا انتقال ہوگیا سو علیؑ کی حیثیت وصی اور آپ کے علم کے وارث کی ہے جن کی ذات میں چاروں مراتب نبوت، رسالت، وصایت اور امامت جمع ہو گئے ہیں۔[۲۵۰] اسمٰعیلی عقیدے کے مطابق یہ ہے علیؑ کا وہ خصوصی امتیاز جس کے سبب اب شریعت کے ظاہر و باطن کی کوئی مستند تفہیم ان کے نسبی سلسلۂ ائمہ منصوص کے بغیر نہیں ہوسکتی۔ اسمٰعیلی عقیدے کے مطابق ولایۃ یا امامت چونکہ منصب نبوت کا ہی ایک تسلسل ہے اس لیے اس بارے میں کسی مشاورت، افہام و تفہیم یا مکالمہ کی سرے سے کوئی گنجائش نہیں۔

امام بنام خدا

مسئلہ امامت کو کسی عقلی گفتگو یا مشاورت سے ماوراء باور کرانے کے لیے فاطمی ائمہ کو ایک ایسے منصبِ تقدیس کا حامل بتایا گیا جہاں عبد اور معبود کا فرق جاتا رہا۔ کہا گیا کہ ان اماموں کا نہ صرف یہ کہ مادّۂ تخلیق مختلف ہے بلکہ زمین و آسمان میں جو کچھ ہے وہ ان ہی کے دم سے قائم ہے۔ بقول فاطمی خلیفہ المُعِز: ہم اس وقت بھی موجود تھے جب کوئی آسمان تھا اور نہ زمین، نہ کوئی آفتاب روشن تھا اور نہ کوئی چاند گردش کرتا تھا۔ یہ فلک دوّار اور کوکب سیّار جو تم اقطار السماوات میں دیکھتے ہو یہ سب ہمارے لیے ہیں۔ ہم اچھے صلبوں سے پاک رحموں میں منتقل ہوتے چلے آرہے ہیں یہاں تک کہ جدّ افضل سید المرسلین، امام النبیین محمدؐ کا زمانہ آیا۔ آیت قرآنی ﴿سنریهم آیاتنا فی الآفاق وفی انفسهم حتی یتبیّن لهم انه الحق﴾ (۴۱:۵۳) ہماری ہی طرف اشارہ ہے۔ ہم عالم قدس کی وہ ارواح ہیں جن کو نسبتِ ذاتی حاصل ہے۔ ہم لدُنّی آیتیں ہیں، ہم سنتے اور دیکھتے ہیں۔[۲۵۱] المُعِز نے تو یہاں تک کہا کہ آیت قرآنی ﴿الله لااله الا هو الحی القیوم﴾ میں اللہ سے مراد عقل اول یا امام الزماں ہیں اور یہ کہ لا الہ الا اللہ کا کلمہ اپنے باطن میں دراصل اس خیال کا حامل ہے کہ لا امام الا امام الزمان۔[۲۵۲] اس کے علاوہ بہت سی قرآنی آیات اور روایتوں سے یہ بات ذہن نشیں کرانے کی کوشش کی گئی کہ شریعتِ محمدی اپنے باطن میں ان الوہی صفت ائمہ کی غیر مشروط اتباع کے علاوہ اور کچھ نہیں۔

فاطمی دعوت کے مؤسسین نے اپنے ائمہ کے گرد تقدیس کا ہالہ کچھ اس طرح تشکیل دیا کہ وہ عام گوشت پوست کے انسان کے بجائے اپنے متبعین کے نزدیک الوہی مخلوق کی حیثیت سے دیکھے جانے لگے۔ ایسی مخلوق جس میں خود

خالق حلول کر گیا ہو۔ جعفر الصادقؒ سے منسوب ایک روایت میں کہا گیا کہ ائمہ کا کثیف مختلف ہے۔[۲۵۳] دورِ ستر کے اسمٰعیلی امام احمد، جنھیں اسمٰعیلی حلقوں میں رسائل اخوان الصفا کا مصنف سمجھا جاتا ہے، نے اس خیال کا اظہار کیا کہ ائمہ جس جوہر سے تخلیق کئے گئے ہیں وہ عام انسانوں کے جوہر سے مختلف ہے۔ بقول امام احمد: ہمارا جوہر سماوی اور ہمارا عالم علوی ہے۔ ہمارے نفوس پر گردش افلاک کا کوئی اثر نہیں ہوتا اور یہ کہ ہم میں اور دوسرے انسانوں میں وہی فرق ہے جو حیوانِ ناطق اور غیر ناطق میں ہے۔[۲۵۴]

کہا جاتا ہے کہ ایک دن کوفہ کی مسجد میں خطبہ کے دوران کسی نے حضرت علیؓ سے پوچھا کہ آپ کو اس امت سے کیا تکلیف پہنچی ہے۔ فرمایا خدا کی قسم جو اذیتیں مجھے پچھلی امتوں نے دی ہیں وہ ان مصائب سے زیادہ ہے جو مجھے اس امت سے پہنچی ہے۔[۲۵۵] بعض روایتوں میں انا الاول وانا الآخر وانا الظاهر وانا الباطن جیسے اقوال بھی حضرت علیؓ سے موسوم کئے گئے ہیں جس سے عام ذہنوں میں یہ تاثر گہرا ہوتا تھا کہ موجودہ امام حاضر جن کی حیثیت سلسلۂ علیؓ کے تسلسل کی ہے، دراصل اسی عقل اوّل کا ظہور ہیں جو مختلف دور میں مختلف انبیاء کی شکل میں ظہور کرتے رہے ہیں اور جن کے بارے میں باطن کے پیچیدہ دفترِ علم میں بسا اوقات یہ احساس ہوتا ہے گویا باری تعالیٰ فی نفسہٖ عقول عشرہ میں حلول کرتا ہوا ان تک آن پہنچا ہے۔[۲۵۶] بھلا جس امام کے بارے میں یہ تصور عام ہو کہ وہ گوشت پوست کے انسان کے بجائے جوہر خدائی سے متصف ہے اس کے سیاسی اقتدار کو کون چیلنج کر سکتا تھا؟

امام کو مظہر خدا کے تقدیسی ہالے میں دیکھنے کی یہ لَے اتنی بلند ہوئی کہ بعض کبار اسمٰعیلی داعیوں نے خدا اور امام کے درمیان پائے جانے والے ابہام کی نقاب بھی کھینچ پھینکی۔ منصور الیمن نے آیت قرآنی ﴿ان اللّٰه كان عليماً خبيرا﴾ کی تاویل میں صراحت کے ساتھ اس خیال کا اظہار کیا کہ اس سے مراد امام علیہ السلام کی ذات ہے۔ یہ بھی کہا گیا کہ آیت قرآنی ﴿واعبدوا اللّٰه ولا تشركوا به شيأً﴾ بھی دراصل امام کی طرف اشارہ کرتی ہے کیونکہ دراصل وہی اللہ ہیں تمام مخلوقات کے پیدا کرنے والے۔[۲۵۷] جعفر الصادقؒ سے منسوب ایک روایت کے ذریعے بھی اسی خیال پر دلیل لائی گئی کہ آپ کی ذات میں فی الواقع رب ذو الجلال ہی جلوہ گر تھا۔ اس روایت کے مطابق جعفر الصادقؒ نے فرمایا لوگو! تم ہمارے امور کو پوشیدہ رکھو اور ہمارے حکم بجا لاؤ ہم تمہیں خلفاء بنا دیں گے جیسا کہ پچھلی امتوں میں ہم نے ان لوگوں کو خلفاء بنایا جنھوں نے ہماری اطاعت کی، ہمارے اسرار کی پردہ پوشی کی اور ہمارے احکام کی تعمیل کی تو ہم نے انھیں انبیاء و رسول بنا دیا اور ان ہی میں سے ملائکہ مقربین مقرر کیا۔ یہ پوچھے جانے پر کہ وہ ملائکہ کون تھے آپ نے فرمایا ان کے نام جبرئیل اور اسرافیل تھے۔[۲۵۸] انبیاء ہوں یا ائمہ، اسمٰعیلی کونی تصور کے مطابق یہ سب خدا کی مختلف ہیکلیں ہیں۔ یہ وہ حجاب ہیں جن میں خدا محتجب ہوتا ہے۔ کہا گیا کہ جعفر الصادقؒ کبھی چاند کی شکل میں ظاہر ہوئے اور کبھی آپ نے

فاطمہؓ اور محمدؐ کا روپ اختیار کیا پھر آپ اپنی دائیں جانب ملتفت ہوئے تو حسنؓ کا مظہر سامنے آیا اور بائیں جانب حسینؓ کی شکل میں دکھائی دیئے۔ پھر اپنی اصل شکل میں لوٹ آئے اور فرمایا هذا كلهٗ واحد بلسانٍ واحد۔ مزید فرمایا هذهٖ قميصى و ملا بسى فى كُلِ وقتٍ و زمان۔[۲۵۹] علی زین العابدین کو اس دعویٰ سے متہم کیا گیا کہ انھوں نے اپنے بارے میں فرمایا کہ نحن وجوهُ الرحمٰن و بيوت الديان اور یہ کہ انا كُل الكل وغاية الغايات۔[۲۶۰] امام المعز کی بعض دعاؤں میں حضرت علیؓ سے یہ قول منسوب کیا گیا کہ أنا عين الله الناظره على عباده۔[۲۶۱] ان روایتوں نے جن کی بنیاد پر دین فاطمی کی عمارت استوار کی گئی تھی نہ صرف یہ کہ توحید کے سلسلے میں گمراہ کن التباسات پیدا کئے بلکہ قرآن مجید کی تاویلات باطلہ نے بہت جلد فاطمی دعوت کی منزل گم کر دی۔

فاطمی ائمہ کی یہ انقلابی تحریک جو بنیادی طور پر عدل و انصاف کے نعرے کے ساتھ منظر عام پر آئی تھی منصبِ امامت پر اپنے نظری دعویٰ کے استحکام میں کچھ اس زور و شور سے آگے بڑھی کہ ان کی تاویلات نے ائمہ کو خدا کے منصب پر فائز کر دیا۔ اولیاء اور مومنین خدا سے مدد مانگنے کے بجائے اس کے مختلف مفروضہ ہیکلوں سے دعائیں مانگنے لگے۔ اسمٰعیلی دعاؤں کی کتابوں میں اس قسم کے کلمات نے مقبولیت حاصل کر لی جس میں مومن خدا کے بجائے محمدؐ سے استعانت کا طالب ہوتا: يا محمداه۔ يا محمداه۔ يا محمداه انى استجيربك فاجرنى و انى استعين بك فاعنى و انى اتوكل عليك فلا تخذ لنى......[۲۶۲]

فاطمی دعوت کے علمبرداروں نے اپنے سیاسی موقف کے استحکام کے لیے تراشیدہ روایتوں اور تاویلات باطلہ کا جس طرح کثرت سے استعمال کیا پروپیگنڈے کی اس فضا میں رفتہ رفتہ متبعین کو ایسا لگا گویا یہ سب کچھ وقتی سیاسی پروپیگنڈے کے بجائے دین کا ثقہ تصور ہو۔ چونکہ سیاسی یا مذہبی معتقدات پر کسی کھلی صحت مند گفتگو کا دروازہ شروع سے ہی بند رکھا گیا تھا اس لیے عام متبعین کو اس بات کا اندازہ بھی نہ ہو سکا کہ دعوتِ ہادیہ کے پردے میں وہ بالآخر کس راستے پر چل نکلے ہیں۔ یا اللہ کے بجائے اسمٰعیلی اوراد و وظائف کی مجلسیں يا عليّاه يا فاطمتاه يا حسناه يا حسيناه اور يا امام الزمان جیسی نامانوس اجنبی صداؤں سے گونج اٹھیں۔ صورت حال یہاں تک جا پہنچی کہ بسم اللہ کے بجائے بسم الله و بسم رسول الله و بسم اميرالمومنين على بن مولانا ابى طالب و بسم مولاتنا فاطمة الزهراء و بسم مولانا الحسن...... و بسم الطيب ابى القاسم اميرالمومنين صلوت الله عليهم اجمعين۔ کا ورد اسمٰعیلی متبعین کا مذہبی شعار بن گیا۔[۲۶۳]

فاطمی داعیوں نے قرآن مجید کے صفحات میں ان خیالات کو پڑھنے کی کوشش کی جس کی نکیر کے لیے قرآن مجید کا نزول ہوا تھا۔ مثال کے طور پر سورہ اخلاص کو لیجئے جو غیر مصالحانہ توحید خالص کی دعوت سے عبارت ہے۔ دعوتِ فاطمی

کے مؤسسین نے اس سورۃ سے پنجتن پاک کا عقیدہ برآمد کیا۔ کہتے ہیں کہ کسی نے جعفر الصادقؒ سے رب کی صفات کے بارے میں سوال کیا۔ آپ نے فرمایا پانچ کلمے ہیں: اللہ احد، محمد الصمد، فاطمہ لم یلد الحسن ولم یولد الحسین ولم یکن لامیر المومنین علی بن ابی طالب کفواً احد۔[۲۶۴] باطنی دروازوں سے وحیِ ربّانی پر شب خون مارنے والوں نے غایت وحی کو اس قدر مسخ کر دیا کہ قرآن کے ظاہری متن کے سلسلے میں سخت التباسات پیدا ہو گئے۔ تاویل کے مستند علم سے صرف کبار داعیوں کے علاوہ اور کوئی واقف نہ تھا سو متن قرآنی میں عام انسانوں کی رہنمائی کا کوئی سامان نہ رہ گیا۔ جب الفاظ معانی سے خالی ہوں اور ان کے بارے میں یہ تاثر عام ہو کہ ان کے حقیقی مفاہیم سے اسمٰعیلی ائمہ اور ان کے کبار داعیوں کو ہی واقفیت ہے پھر عام لوگوں کے لیے وحی ربانی میں دلچسپی کا ختم ہو جانا فطری تھا۔ بالخصوص ایک ایسی صورت حال میں جب روایتیں یہ بھی بتاتی ہوں کہ آپؐ نے فرمایا کہ اے علیؓ تم میں ﴿قل هو الله احد﴾ کی مثل یا شبیہ ہے جسے ایک بار پڑھنے کا ثواب پورا قرآن پڑھنے کے برابر ہے۔[۲۶۵]

امام کی قمیص میں خدا کی جلوہ گری اور مختلف ادوار میں مختلف ائمہ میں اس کے ظہور کے عقیدے نے بالآخر مومنین کو اولیاء کی اتباع کے بجائے ان کی پرستش میں مبتلا کر دیا۔ امام کا ہر حکم غیر مشروط اطاعت کا سزاوار قرار پایا اور یہ خیال عام ہوا کہ امام کی تعظیم دراصل خدا کی تعظیم ہے۔ کہا گیا کہ سلمان فارسیؓ نے رسول اللہؐ کو ایک دن صرف اس لیے سجدہ کیا تھا کہ انھوں نے آپؐ کی پیشانی میں امامت کا نور دیکھا تھا۔[۲۶۶] نبیؐ اگر محض نورِ امامت کے سبب سجدے کا مستحق ہو سکتا تھا تو پھر سراپا امام کے آگے سجدہ ریزی سے کون سی چیز روک سکتی تھی۔ بعض فاطمی ائمہ نے علی الاعلان خود کو سجدے کا مستحق قرار دے ڈالا۔ انھوں نے اپنے گرد ہیبت و جبروت کا وہ ماحول طاری کر رکھا تھا کہ ان کے وزراء اور امراء بھی جب ان کے سامنے آتے تو ان پر کچھ ایسی ہیبت طاری ہوتی کہ وہ ولی السجود کے سامنے بلا تکلف سجدے میں گر جاتے۔[۲۶۷] اسمٰعیلی دعوت کی کتابیں مومنین کو یہ آداب سکھاتی تھیں کہ وہ امام کے سامنے اس طرح ادب سے کھڑا رہے جیسا کہ وہ نماز میں کھڑا ہوتا ہے۔ قاضی النعمان نے مومنین کو سجدہ کی ترغیب دلاتے ہوئے لکھا ہے کہ اگر کوئی شخص امام کو تعظیماً سجدہ کرے تو اس میں کچھ حرج نہیں۔[۲۶۸]

بولایتک یا علی!

انبیاء، اوصیاء اور ائمہ کے بارے میں یہ خیال عام ہوا کہ یہ سب کے سب ایک ہی ذات کی مختلف ہیکلیں ہیں۔ البتہ ائمہ کو ان سبھوں پر خاص فضیلت حاصل ہے۔ ایسا اس لیے کہ اسمٰعیلی شارحین کے مطابق انبیاء سے بسا اوقات غلطیاں

سرزد ہوتی رہیں جیسا کہ آنحضرتؐ کی غلطی پر قرآن مجید نے اس طرح تادیب کی:[۲۶۹] ﴿لیغفر لك اللہ ما تقدم من ذنبك و ما تأخر﴾ جبکہ ائمہ تمام گناہوں سے معصوم و مامون ہیں اور اسی لیے ان کا رتبہ کسی نبیٔ مرسل سے چار درجے افضل ہے۔[۲۷۰] حضرت علیؓ کی ذات میں چونکہ امامت، وصایت، رسالت اور نبوت چاروں مراتب جمع ہو گئے،[۲۷۱] اس لیے بھی اسمٰعیلی عقیدے کے مطابق ان کا مقام انبیائے مرسلین سے کہیں بلند ہے۔ کہا گیا کہ نہ جانے کتنے انبیاء کی نبوت صرف اس لیے ساقط ہو گئی کہ انھوں نے ولایت علیؓ کو قبول کرنے میں پس و پیش سے کام لیا۔[۲۷۲] راویوں نے یہ بھی کہا کہ علیؓ کے مقامِ بلند کے سبب خود رسولؐ اللہ نے ایک بار برسرِ مجلس علیؓ کا ہاتھ پکڑ کر اس امر کی شہادت دی کہ یا معشر الناس ھذا علی اخی... والخلیفة من بعدی ... وابو عترتی وساتر عورتی ومفرج کربتی ... وغافر خطیئتی۔[۲۷۳] محمدؐ پر علیؓ کی فوقیت ثابت کرنے کے لیے اس قسم کی تراشیدہ روایتیں بھی عام ہوئیں جن کے مطابق محمدؐ رسول اللہ جب شب معراج چوتھے آسمان پر پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ علیؓ کرسیٔ کرامت پر بیٹھے ہیں اور فرشتے ان کے چاروں طرف ان کی تسبیح و تقدیس میں مشغول ہیں۔ پوچھنے پر پتہ لگا کہ علیؓ کی بلند مقامی کے سبب فرشتے ان کی دیدار کے بہت مشتاق تھے سو اللہ تعالیٰ نے ایک فرشتہ خاص آپؓ کی صورت میں پیدا کیا اور دوسرے فرشتوں پر ان کی عبادت واجب کی۔[۲۷۴] کہنے والوں نے یہ بھی کہا کہ کسی نبی کی توبہ، کسی ولی کا تقرر، کسی وصی کی امامت اور کسی عامل کی اطاعت خواہ وہ اپنے آپ کو عبادت میں فنا کیوں نہ کر لے، اس وقت تک قبول نہیں کی جاتی جب تک کہ وہ علیؓ کی ولایت کا اقرار نہ کر لے۔[۲۷۵] علیؓ کے سلسلے میں اس قسم کی غلوِ فکری فرقۂ اسمٰعیلیہ کی نظری شناخت قرار پائی حتیٰ کہ ان کے معتدل داعیوں نے بھی علیؓ کو اگر محمدؐ سے آگے نہیں بڑھایا تو پیچھے بھی نہیں رکھا۔ جیسا کہ آٹھویں داعی مطلق حسین بن علی کا فرمان ہے کہ محمدؐ اور علیؓ دونوں کا رتبہ اور درجہ برابر ہے، ایک کو دوسرے پر فضیلت نہیں۔ جس نے ایک کو دوسرے سے افضل سمجھا اس نے ایک کے بارے میں غلو کیا اور دوسرے کے سلسلے میں تقصیر کا مرتکب ہوا۔[۲۷۶] بعضوں نے یہ بھی کہا کہ محمدؐ تو صرف مستودع اور پیغمبر تھے جو ولایت علیؓ کا پیغام پہنچانے پر مامور تھے ورنہ اصل امامتِ استقراری کے حقیقی وارث تو علیؓ ہیں۔[۲۷۷] ورنہ آخر کیا وجہ ہے کہ محمدؐ خود کو یہ کہنے پر مجبور پاتے ہوں: النظر الی وجه علی عبادة۔[۲۷۸]

تعطیلِ شریعت: اسلام کا باطنی دور

علیؓ کی ولایت کے تو اثناعشری بھی قائل ہیں اور صوفیاء بھی۔ سنّی عملیات کی کتابوں میں بولایتک یا علیؓ کی گونج نامانوس نہیں اور اسی طرح ائمہ معصومین کو انبیاء سے چار درجے افضل سمجھنا اثناعشری شیعوں کے ہاں بھی مقبول عام تصور

ہے۔ البتہ جہاں سے اسمٰعیلیوں کا راستہ اہل تشیع کے دوسرے طائفوں اور سنّیوں سے الگ ہو جاتا ہے وہ اسمٰعیل کی امامت اور اس سے بڑھ کر محمد بن اسمٰعیل کے سلسلے میں یہ عقیدہ ہے کہ وہ ساتویں ناطق، ساتویں رسول[۲۷۹] اور قائم ہیں جنھوں نے دورِ محمدی کے ظاہر کو معطل کر دیا اور جن کی آمد پر شریعت کے باطنی دور کی ابتداء ہوگئی۔ اسمٰعیل کی حیثیت چونکہ ساتویں امام کی ہے اور یہ سات امام متمین کہلاتے ہیں یعنی جن کی تکمیل پر باطن کی ابتداء ہوا اور ظاہر معطل ہو جاتا ہو، جیسا کہ جعفر بن منصور الیمن سے صراحتاً منقول ہے کہ ...وکذالك بعد تمام هؤلاء السبعة الائمة والخلفاء الثمانية يتم امر محمد الجسمانى وينفتح الدور الروحانى۔[۲۸۰] گوکہ تعطیلِ شریعت کے بارے میں اسمٰعیلی داعیوں میں اختلافات پائے جاتے ہیں البتہ راجح اور مقبولِ عام تصور یہی ہے کہ قائم القیامہ کے عہد میں شریعت کے احکام اٹھالئے جاتے ہیں بالکل اسی طرح جیسے آدمؑ کے عہد میں کوئی شریعت نہ تھی۔[۲۸۲]

محمد بن اسمٰعیل سے شروع ہونے والا رسالۂ محمدی کا یہ دور اپنے پچھلے دور سے اتنا مختلف تھا کہ اس پر بجا طور پر ایک نئے دین کا گمان ہوتا تھا۔ ایسا اس لیے بھی کہ محمد بن اسمٰعیل کی حیثیت صرف امام کی نہیں بلکہ ساتویں ناطق کی حیثیت سے ساتویں رسول کی بھی بتائی گئی جو اس نقطۂ نظر کے مطابق انبیائے سابقین آدمؑ، نوحؑ، ابراہیمؑ، موسیٰؑ، عیسیٰؑ اور محمدؐ کے بعد اس سلسلے کی ساتویں کڑی ہیں۔[۲۸۳] اس اعتبار سے دیکھا جائے تو اسمٰعیلی مذہب، جہاں ظاہر معطل اور باطن جاری ہے، دو محمدوں کا دین ہے۔ دونوں رسالت کے منصب پر فائز ہیں البتہ یہاں محمد بن اسمٰعیل کو محمد رسولؐ اللہ پر اس اعتبار سے فوقیت حاصل ہے کہ انھوں نے الناطق السابع کی حیثیت سے پچھلے دور کی تکمیل کی اور شریعت محمدی کے باطن کے انکشاف کے بعد اس کے ظاہر کو معطل کر دیا۔ بقول صاحبِ زہر المعانی: فكان محمد بن اسمٰعيل متم الدور وخاتم الرسل المنتهية اليه غاية الشرائع المختوم۔ اسمٰعیلی شارحین کے مطابق محمد بن اسمٰعیل کا رتبہ تو یہ ہے کہ آپ کی رسالت پر خود محمد رسولؐ اللہ نے گواہی دی۔ جیسا کہ کلمۂ محمد رسول اللہ سے ظاہر ہے۔ ورنہ محمد رسولؐ اللہ کا خود اپنے حق میں گواہی دینا کیا معنی رکھتا ہے۔ رہے عام مسلمان تو یہ لوگ جب پہلی بار اذان میں محمد رسول اللہ کہتے ہیں تو اس سے مراد محمدؐ بن عبداللہ کی رسالت پر شہادت قائم کرنا ہوتا ہے جبکہ دوسری بار اس سے مراد محمد بن اسمٰعیل کی رسالت کا اقرار ہوتا ہے۔[۲۸۴]

محمد بن اسمٰعیل سے شروع ہونے والا دین کا باطنی دور اس اعتبار سے اپنے سابقہ دوائر سے ممتاز بتایا گیا کہ اب تک پچھلے رسولوں نے علوم کی جو کھیتی لگائی تھی اس کی ثمر آوری کا کام ساتویں امام اور رسول محمد بن اسمٰعیل کے ذریعہ اپنے اتمام کو پہنچا بالکل اسی طرح جیسا کہ قصۂ یوسفؑ میں سات سال تک زراعت کی بات کی گئی ہے۔ محمد بن اسمٰعیل نے صرف پچھلے انبیاء کی فصل ہی اکٹھا نہیں کی بلکہ اس کھیتی سے باطن کی طرح اناج نکال لیا اور ظاہر یا بھوسی چوپایوں کے

لیے پھینک دی۔[۲۸۴] اب جو لوگ ظاہر پرست ہیں وہ تو یقیناً شرعی تکالیف مثلاً نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ جیسے امور کی پاسداری کو اتباعِ شریعت سے تعبیر کریں گے البتہ جو لوگ باطن یا مغز سے واقف ہو گئے ہیں اور جو یہ سمجھتے ہیں کہ ان اعمال شرعی کی واقعی غایت کیا ہے انھیں ان امور کو بجالانے کی کوئی حاجت نہ ہوگی۔[۲۸۵]

دین کے اس باطنی دور میں ظاہری شریعت کی اہمیت یکسر ختم ہوگئی۔ کہا گیا کہ قائم کا عہد محض تاویل سے عبارت ہے ان کی کوئی شریعت نہیں بلکہ ان کا تو کام ہی یہ ہے کہ وہ تاویل محض کے انکشاف کے ذریعے تمام شریعتوں کو منسوخ کردیں۔[۲۸۶] بالفاظ دیگر یہ کہہ لیجئے کہ دورِ قائم کو ایک ایسے دور سے تعبیر کیا گیا جب احکامِ شریعت کی حکمتیں بتائی جائیں گی، تاویلات ظاہر کی جائیں گی لیکن ظاہری عمل کی طرف کسی کو دعوت نہ دی جائے گی۔ بقول المعز قائم یہ تو بتائیں گے کہ تیس روزے کیوں ہیں چالیس کیوں نہیں؟ یا یہ کہ پہلی دو رکعتوں میں سورہ فاتحہ کے ساتھ دوسری سورتیں کیوں پڑھی جاتی ہیں اور دوسری دو رکعتوں میں ایسا کیوں نہیں ہے؟ البتہ وہ نماز پڑھنے یا روزہ رکھنے کا حکم نہیں دیں گے۔[۲۸۷] گویا قائم کا عہد ایک ایسے دور سے عبارت ہے جب حدود و مراتب ساقط ہو جاتے ہیں[۲۸۸] اور جب علم بلاعمل کا دور دورہ ہوتا ہے۔[۲۸۹]

تاویل بنام تنزیل

اسمٰعیلی شارحین اپنے مخالفین کے مقابلہ میں اس نکتہ سے کہیں زیادہ آگاہ تھے کہ غایتِ متن کو تعبیر و تاویل کے فن سے شکست دینا کچھ مشکل نہیں اور یہ کہ تاویل کی یدِطولیٰ پر جسے جتنی زیادہ قدرت ہوگی وہ اپنے مقاصد کے حصول کے لیے متن کی تاویلات کو اتنی ہی قوت اور اعتماد کے ساتھ استعمال کر سکے گا۔ مناقب اور شانِ نزول کی روایتیں جو مختلف فرقوں نے اپنے ذہنی رجحانات کی تائید کے لیے رواج دے رکھی تھیں اور اختلاف قرأت کی مختلف روایتیں، ھکذا نزلت کی تکرار نے وحی ربانی پر باطنی علم کا تیشہ چلانے کے لیے مناسب ماحول فراہم کر دیا تھا۔ یہ تھا وہ ماحول جس میں رسول اللہؐ سے منسوب اس قول ما نزلت علی من القرآن آیة الا ولها ظاهر و باطن[۲۹۰] کی گونج تیز سے تیز تر ہوتی گئی۔ متن قرآنی پر تاویل باطنی کا یہ حملہ اب تک کا سب سے کاری وار تھا جس نے نہ صرف یہ کہ ظاہری متن کو بے جان اور معطل کر کے رکھ دیا بلکہ آگے چل کر اس خیال کے زیر اثر علمائے باصفا نے امت کے ہاتھوں میں مختلف باطنی قرآن تھما دیئے۔ اس طرح ایک سیاسی دعوت جو بنیادی طور پر اپنے زمانے میں اصلاحِ احوال کے لیے اٹھی تھی اور جس کا دعویٰ تھا کہ وہ آلِ فاطمہؓ کی تنصیب امامت کے ذریعہ فکری اور سیاسی زوال کا سدِّ باب کر پائے گی، بدقسمتی سے ایک ایسے منہج فکری کے تعارف اور اس کے استحکام کا ذریعہ بن گئی جو تب سے اب تک مختلف سطحوں پر غایتِ وحی سے مسلسل مزاحم

ہوتا رہا ہے۔ اثنا عشری شارحین کی طرح قرآن مجید کی باطنی یا اسمٰعیلی تاویل بھی اس خیال سے عبارت ہے کہ نزولِ قرآن کا بنیادی مقصد ولایۃ علیؑ پر دلیل لانا ہے۔ تاویل کے اس باطنی منہج کی تراش وخراش میں اسمٰعیلی شارحین نے ہندی، یونانی، یہودی، عیسائی اور اہل ظاہر کے علاوہ اثنا عشری طریقۂ تاویل سے بھی خاطر خواہ استفادہ کیا ہے۔ بلکہ امامت پر دلیل لانے والی بعض تاویلات تو بعض اثنا عشری مفسرین کا نتیجۂ فکر معلوم ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر ﴿الم تر الی الذین اوتوا نصیبا من الکتاب یومنون بالجبت والطاغوت﴾ کی تاویل میں مؤید نے جبت وطاغوت سے خلیفۂ اول اور خلیفۂ ثانی مراد لیا ہے جو اثنا عشری تفسیر صافی کے عین مطابق ہے۔[۲۹۱] اسی طرح ﴿والتین والزیتون وطور سینین وھذا البلد الامین﴾ کے بارے میں اسمٰعیلی علماء کا کہنا کہ یہاں التین سے مراد امام حسنؓ، الزیتون سے امام حسینؓ، طور سینین سے حضرت علیؓ اور البلد الامین سے محمد رسول اللہؐ ہیں، تفسیر صافی کے عین مطابق ہے۔ جس سے کم از کم اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ باطنی تاویل کے اسرار ورموز سے صرف اسمٰعیلی شارحین ہی آگاہ نہیں ہیں اور یہ کہ اس فن کی ترتیب وتنظیم میں ان حضرات نے اپنی جودتِ طبع کے علاوہ اس عہد کے دوسرے مآخذ سے بھی بھرپور استفادہ کیا ہے۔

گو کہ اسمٰعیلی شارحین کے مابین تاویل میں بسا اوقات ناقابل تطبیق اختلافات سامنے آتے ہیں البتہ اس بارے میں سبھوں کا اتفاق ہے کہ قرآن مجید کی ہر آیت کے پیچھے تنصیب ولایۃ اور اس کے تسلسل سے متعلق کوئی نہ کوئی نکتہ ضرور پایا جاتا ہے۔ کواکب وافلاک کا بیان ہو یا لوح وقلم کا تذکرہ، مشکوٰۃ ومصباح کی بات ہو یا فجر ولیل کا قرآنی بیان، اسمٰعیلی شارحین ہر جگہ فاطمی اہل بیت اور ان کے ائمہ کے سلسلے میں کوئی نہ کوئی اشارہ ڈھونڈ نکالتے ہیں۔ اور چونکہ ان تعبیرات میں کسی طئے شدہ اصول کی پاسداری لازم نہیں ہوتی اس لیے قاری کو یہ سہولت حاصل رہتی ہے کہ وہ جب چاہے قرآن مجید کی کسی بھی آیت میں وصایۃ وامامت کا بیان پڑھ سکتا ہے۔ اس خیال کی قدرے تفصیلی وضاحت کے لیے کتاب الکشف سے سورۃ الفجر کے بعض بنیادی تاویلی نکات ملاحظہ ہوں۔ صاحبِ کتاب الکشف کے مطابق الفجر سے مراد محمد رسول اللہؐ، لیال عشر سے حضرت علیؓ، الشفع سے حسنؓ، الوتر سے حسینؓ اور اللیل سے فاطمہؓ مراد ہیں۔ عاد سے ظالم اوّل کی طرف اشارہ ہے جو اسمٰعیلیوں کے ہاں خلیفۂ اوّل کے لیے رائج تلمیح ہے۔ ارم ذات العماد حضرت علیؓ کی ذات ہے کہ آپ کی حیثیت عماد الدین کی ہے۔ وثمود الذین جابوا سے مراد ظالم ثانی عمر فاروقؓ ہیں۔ فرعون سے ظالم ثالث کی طرف اشارہ مقصود ہے جو اسمٰعیلی داخلی حلقہ میں خلیفۂ ثالث کے لیے معروف اصطلاح ہے۔ الذین طغوا فی البلاد سے مراد معاویہؓ، عمرو بن عاصؓ اور دوسرے اصحابِ جمل ہیں۔ صوت عذاب حضرت علیؓ کی تلوار ہے۔ یتیم سے حضرت علیؓ کی طرف اشارہ مقصود ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ تاکلون

التراث میں ان لوگوں کو متنبہ کیا گیا ہے جنھوں نے حضرت فاطمہؓ کی میراث غصب کر لی تھی۔[۲۹۲] ان تشریحی نکات سے اس بات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ماہرین تاویلات نے اپنے موقف کو احق ثابت کرنے کے لیے قرآن کو کس طرح سیاسی پروپیگنڈے اور پارٹی مینی فیسٹو کی طرح پڑھنے پڑھانے کی کوشش کی۔

گذشتہ صفحات میں ہم آیت قرآنی ﴿انا فتحنا لك فتحا مبينا ليغفرلك الله ما تقدم من ذنبك وما تأخر﴾ کی اسمٰعیلی تاویل کے حوالے سے یہ بتا چکے ہیں کہ کس طرح اس آیت کو آیتِ وصایۃ کے طور پر پڑھنے کی کوشش بالآخر شارحین کو رسول اللہ کے اگلے پچھلے گناہوں کی تحقیق وافشا کی طرف لے آئی۔ ذنبِ رسولؐ کی تلاش میں یہ لوگ قیاس کی مختلف وادیوں میں جا نکلے۔ کسی نے کہا کہ آپؐ کا پچھلا گناہ یہ تھا کہ آپؐ نے حضرت ابوبکرؓ کو ان اسرار سے آگاہ کر دیا جس کے وہ مستحق نہ تھے اور اگلا گناہ یہ تھا کہ آپؐ نے اپنی ایک بیوی کو اس خبر سے مطلع کر دیا کہ تمہارے والد ظلم و جبر سے میری جگہ حاصل کریں گے۔[۲۹۳] کسی نے کہا کہ آیت قرآنی ﴿ان الله وملئكته يصلون على النبى يا ايها الذين آمنوا صلوا عليه و سلموا تسليما﴾ کے معنی یہ ہیں کہ اللہ اور اس کے ملائکہ وصی کو نبی کے پیچھے رکھتے ہیں سوائے لوگو! جو ایمان لائے ہو تم بھی وصی کو نبی کے پیچھے رکھو یعنی اس آیت سے خلیفہ بلافصل پر استشہاد مقصود ہے۔[۲۹۴] اسی طرح ﴿ذرنى والمكذبين﴾ کا اشارہ ان لوگوں کی طرف بتایا گیا جنھوں نے ولایۃ علیؑ کا انکار کیا۔[۲۹۵] کہنے والوں نے یہ بھی کہا کہ اصل مشرکین تو وہ لوگ ہیں جنھوں نے علیؓ کی ولایۃ میں شرک کیا اور ان ہی کے بارے میں یہ تحذیر قرآنی وارد ہوئی ہے ﴿لئن اشركت ليحبطن عملك﴾ یعنی اے رسول! تم نے علی کے علاوہ کسی اور پر نص کی تو تمہاری رسالت ساقط ہو جائے گی۔[۲۹۶] اور ایسا کیوں نہ ہو جب ﴿واذا اخذنا ميثاقكم﴾ سے یہ شارحین واقعۂ میثاقِ وصایۃ مراد لیتے ہوں جو ان حضرات کے بقول غدیر خم میں پیش آیا تھا۔[۲۹۷] ﴿واذا نودى للصلوٰة من يوم الجمعة...﴾ کی آیت میں ان حضرات نے نمازِ جمعہ سے محمد رسول اللہ کی دعوت اور ذکر اللہ سے حضرت علیؓ کی ذات مراد لی۔[۲۹۸] ﴿ذالك الكتاب﴾ جو اکتشافی ذہن کے لیے کتاب کائنات کا استعارہ تھا، اہل تاویل کے نزدیک حضرت علیؓ کی طرف اشارہ قرار پایا۔ ﴿الله نور السمٰوات﴾ میں نور سے نورِ ائمہ، مشکوٰۃ سے حضرت فاطمہؓ، مصباح سے حضرت حسینؓ، فى الزجاجه سے حضرت فاطمہؓ جو ﴿كوكب درى﴾ کی مانند ہیں مراد لی گئیں۔[۲۹۹] اس قبیل کی تاویلات نے فاطمی خلافت اور ان کے داعیوں کے لیے بعض حلقوں میں نظری، سیاسی اور روحانی جواز کا سامان تو شاید فراہم کر دیا ہو البتہ جو لوگ ان تاویلات پر ایمان لے آئے ان کے لیے غایت وحی سے آگہی کا امکان جاتا رہا۔

ان تاویلات نے وحی ربّانی کو بازیچۂ اطفال بنا کر رکھ دیا۔ ایک ہی آیت کی تاویل میں کبار داعیان اور ائمہ تاویلات کی مختلف وادیوں میں جا نکلے۔ تفنن طبع کے اس غیر ذمہ دارانہ مظاہرے نے تاویلات کے نام پر ایک طرح کی

دانشورانہ انارکی کو جنم دیا۔ مثال کے طور پر الف، لام، میم (الٓم) کی تاویل کو لیجئے جس کے بارے میں اسمٰعیلیوں کا خیال ہے کہ حروف مقطعات کا علم ان کا امتیازی سرمایہ ہے۔ المعز کے مطابق یہ تینوں حروف حدود روحانیہ علویہ پر دلالت کرتے ہیں کہ ان کے اوپر نہ کوئی نقطہ ہے اور نہ علامت۔[۳۰۰] البتہ مؤید کے نزدیک الف اور لام اللہ تعالیٰ کے دو روحانی نام ہیں اور میم اس کا جسمانی نام ہے۔ ان تینوں حروف کی قسم کھا کر وہ یہ کہتا ہے کہ یہ حضرت علیؓ کی صفت ہے۔[۳۰۱] اس کے برعکس بدر الجمالی کا موقف ہے کہ الف سے القلم، لام سے لوح اور میم سے وہ شئے مکتوب مراد ہے جو اس لوح میں لکھی ہوئی ہے۔ اور یہی اس بات کا سبب ہے کہ الٓم کے بعد ذالک الکتاب کے الفاظ وارد ہوئے ہیں۔[۳۰۲] تاویلات کی اس متحارب رنگ آمیزی میں سائل کے لیے یہ فیصلہ کرنا دشوار ہو گیا کہ وہ کس تاویل کو قرین ثواب سمجھے اور کسے مسترد کر دے۔

بعض اوقات ان تاویلات کے ذریعے ماضی اور مستقبل کی تاریخ کو منکشف (uncode) کرنے کی کوشش بھی کی گئی تا کہ قاری کو یہ بتایا جا سکے کہ فاطمی خلافت کا ظہور تاریخ کی الٰہی اسکیم کا حصّہ ہے جس کی خبر متن قرآنی کے باطن میں پہلے ہی سے موجود ہے۔ ﴿الٓم غلبت الروم﴾ کی وہ تاویل جو امام حاکم کے باب الابواب سیدنا حمید الدین نے پیش کی ہے اس قبیل کی ایک بہترین مثال ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک بار رسولؐ اللہ نے حضرت علیؓ سے یہ فرمایا کہ اگر مجھے خوف نہ ہوتا کہ میری امت تمہارے بارے میں وہ کہہ دے جو نصاریٰ نے عیسیٰؑ کی شان میں کہہ دیا تھا تو میں تمہاری شان میں ایسی باتیں کہتا جس کے سبب لوگ تمہارے وضو کا پانی اور پیر کے نیچے کی مٹی جمع کرتے اور اس سے شفا حاصل کرتے۔ اس روایت سے یہ نکتہ برآمد کیا گیا کہ حضرت علیؓ عیسیٰؑ کے مثل ہیں اور آپ کے شیعہ روم سے عبارت ہیں۔ سو آیت ﴿غلبت الروم﴾ میں دراصل اہل بیت اور شیعانِ علیؓ کے ساتھ پیش آنے والی تاریخ کی خبر دی گئی ہے۔ اولاً شیعہ مخالفین کے ہاتھوں مغلوب ہو جائیں گے ﴿وھم من بعد غلبھم سیغلبون﴾ پھر وہ ائمہ حق کی مدد سے اپنے مخالفین پر غلبہ حاصل کر لیں گے۔ ﴿فی بضع سنین﴾، یہ سب کچھ سات سالوں میں ہو جائے گا۔ پھر جیسا کہ خدا کا فرمان ہے ﴿لله الامر من قبل و من بعد﴾ یعنی امر ربّی کا نفاذ جیسا کہ عہد رسولؐ اللہ میں تھا اسی طرح مخالفینِ شیعہ کے مغلوب ہونے کے بعد ہوگا۔ دین خالص پوری طرح قائم ہو جائے گا اور امامت ذریت طاہرہ کی طرف لوٹ جائے گی۔ رہی یہ بات کہ الف، لام، میم کے تین حروف اس آیت کی ابتدا میں کیوں آئے ہیں تو اس سے دراصل اس خبر کی عقدہ کشائی مقصود ہے کہ تین ظالم حضرت علیؓ کا حق چھین لیں گے۔ حروف کی عددی قدر کی ترتیب و تنظیم سے، جس میں کسی متعینہ اصول کا فقدان ہے، بنو امیہ اور آلِ عباس کے ظالموں کا سراغ بھی بعض دوسری آیتوں کی مدد سے لگایا گیا اور اس خیال پر دلیل قائم کی گئی کہ تاریخ کے اس لمحہ پر فاطمی خلافت کا ظہور امر ربّی ہے، خدائی اسکیم کا حصّہ ہے جس کی

تفصیلی خبر متنِ قرآنی کے باطن میں موجود ہے اور کیوں نہ ہو جب اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے کہ وما فرّطنا فی الکتاب.....الخ

متنِ قرآنی کو اپنے سیاسی رجحانات کے تابع کرنے کی یہ مہم بالآخر اسمٰعیلی شارحین کو تحریفِ قرآن کے راستے پر لے آئی۔ بعض اثناعشری مفکرین کی طرح اسمٰعیلی شارحین نے بھی اس خیال کا برملا اظہار کیا کہ حضرت علیؓ نے ایک علیحدہ قرآن جمع کیا تھا جسے اہل ظاہر نے قبول نہیں کیا اور جس میں قرآن کی بعض آیات مختلف تبدیلیوں کے ساتھ پائی جاتی تھیں۔[۳۰۳] قرآنِ مجید کی یہ مفروضہ آیات جسے اسمٰعیلی علماء اہل بیت کی قرأت سے تعبیر کرتے تھے ان اضافوں سے عبارت تھی جن سے حضرت علیؓ کی وصایت یا امامت پر استشہاد مقصود تھا۔ مثال کے طور پر ﴿یا ایها الرسول بلغ ما انزل علیك من ربك فان لم تفعل فما بلغت رسالته﴾ کے بارے میں کہا گیا کہ قرأتِ اہل بیت کے مطابق اس آیت میں من ربك کے بعد فی علی کے الفاظ بھی پائے جاتے تھے۔[۳۰۴] ﴿فاذا فرغت فنصَب﴾ دراصل فاذا فرغت فنصِب (ص پر زیر) وارد ہوا تھا جس سے علیؓ کی تنصیب منصبی مقصود تھی۔ کسی نے کہا کہ آیت قرآنی ﴿لا تحرك به لسانك لتعجل به ان علینا جمعه و قرانه فاذا قرأناه فاتبع قرآنه ثم ان علینا بیانه﴾ دراصل اس طرح نازل ہوئی تھی: لا تحرك به لسانك لتعجل به ان علیّاً جمعه و قرآنه فاذا قرأناه فاتبع قرآنه ثم ان علیّاً بیانه۔ جس سے دراصل یہ بتانا مقصود تھا کہ جمع اور قرأت کا کام علیؓ کے ذمّہ ہے۔ تمہارا کام تو اے رسولؐ یہ ہے کہ جب وہ پڑھیں تو تم ان کا اتباع کرو۔ ثم ان علیّاً بیانه یعنی تشریح و تعبیر کی ذمہ داری بھی علیؓ کے سر ہے۔[۳۰۵]

تاویلات کی اس گرم بازاری نے جہاں ایک طرح کی دانشورانہ انارکی کو جنم دیا وہیں حق تاویل پر ائمہ اور داعیان کی اجارہ داری قائم ہو جانے سے اب عام لوگوں کے لیے متن قرآنی بے جان اور منجمد الفاظ کا ایک ایسا مجموعہ بن کر رہ گیا جس کی افادیت مشکوک تھی۔ جب یہ خیال عام ہو کہ مطالب قرآنی سے صرف وہی لوگ آگاہ ہو سکتے ہیں جن کے پاس علم تاویل سینہ بہ سینہ ائمہ سے منتقل ہوا ہو تو ایسی صورت میں عام لوگوں کے لیے وحی کے چشمۂ صافی سے اکتساب کا امکان کیسے برقرار رہ سکتا تھا؟ اہل تاویل نے یہاں تک کہہ ڈالا کہ غایت وحی سے یا تو خدا آگاہ ہے یا وہ خود جو الراسخون فی العلم کے منصب پر فائز ہیں جیسا کہ ان کے خیال میں ﴿وما یعلم تاویله الا الله والراسخون فی العلم یقولون آمنا به﴾ سے ظاہر ہے۔ اہل تاویل کے نزدیک اس آیت میں الا الله پر وقف کرنا درست نہیں کہ تاویل کا علم خدا کے علاوہ ان علماء کو بھی ہے جو علم میں راسخ ہیں مثلاً انبیاء، اوصیاء اور ائمہ وغیرہ۔[۳۰۶] علمائے باطن کی تاویلات کو قرآنی سند عطا کئے جانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت جلد اسمٰعیلی حلقوں سے ایسے اصحاب باطن نکل آئے جنھوں نے ظاہری اعمال ترک کر دیئے اور محرمات کو اپنے اوپر مباح کر لیا۔ فکر و نظر کی انارکی نے بالآخر الدعوۃ الهادیة کے نقباء

کی راہ گم کر دی۔[۳۰۷] قرآن مجید جو کبھی اکتشافی ذہن کا نقیب سمجھا جاتا تھا ایک ایسے پراسرار اور پیچیدہ وثیقہ کے طور پر دیکھا جانے لگا جس کے مطالب کے بارے میں کوئی بات وثوق سے کہنا مشکل تھی کہ تاویلات کی کتابیں کسی ذہنی تعذیر و تعذیب سے کم نہ تھیں۔ اسمٰعیلی داعیوں اور ان کے متبعین کی بہترین ذہنی صلاحتیں تاویل کی پیدا کردہ تشتت فکری کا شکار ہو گئیں۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس منہجِ تعبیر نے اکتشافی ذہن کو ایک طرح کے سفرِ معکوس سے دوچار کر دیا۔

قرآن الاُمّہ بنام قرآن الائمّہ

اسمٰعیلی متبعین کے حلقوں میں اس خیال نے قبولیتِ تامہ اختیار کر لی کہ مروجّہ قرآن اولاً تو اپنے اصل نسخے سے مطابقت نہیں رکھتا کہ اصل قرآن، جس میں بعض داعیوں کے مطابق مصحف فاطمہؓ کے اجزاء بھی شامل تھے، اب قائم کے ظہور تک لوگوں کی نگاہوں سے مستور کر دیا گیا ہے۔ ثانیاً، باطنی معنیٰ سے آگہی کے بغیر متنِ قرآنی مومنین کو کچھ بھی فائدہ نہیں دے سکتا۔ ثالثاً، علمائے تاویل نے وحی ربانی کا تمام ترعرق اپنی کتابوں میں کشید کر لیا ہے جس کی تعلیم مستحقین کے لیے مخصوص ہے۔ گویا اہل ظاہر کا یہ قرآن الفاظ کا ایک ایسا خالی خولی ڈھانچہ ہے جسے عامّہ (کالانعام) کی تلاوت کے لیے چھوڑ دیا گیا ہے۔ بعض داعیوں نے قرآن مجید کو تحقیراً قرآن الاُمّہ سے موسوم کیا[۳۰۸] اور اس کے مقابلہ میں اخوان الصفا کو قرآن الائمّہ کا مرتبہ عطا کیا جسے اسمٰعیلی حلقوں میں ہمیشہ سے علوم و معرفت کے لازوال ماخذ کی حیثیت سے دیکھا جاتا رہا ہے اور جس کا غیر قرآنی اور غیر عقلی دائرۂ فکر صدیوں سے مسلم ذہن سے مزاحم ہے۔

اخوان الصفا کے مرتبین نے بعض دھاردار سوالوں کو کچھ اس طرح ترتیب دیا کہ عام ذہنی سطح کا آدمی چند ثانیے کے لیے مبہوت ہو جائے اور اسے ایسا محسوس ہو گویا رموزِ شریعت سے آگہی کی شاہِ کلید ان مستور داعیوں کے ہاتھوں میں ہے جو نہ صرف یہ کہ احکام کی حکمتوں اور ان کے باطن سے بخوبی واقف ہیں بلکہ انہیں ائمہ آلِ بیت سے متصل ہونے کے سبب ملائے اعلیٰ سے بھی آگہی حاصل ہے۔ ابتدائے آفرینش سے جو کچھ ہوتا آ رہا ہے مثلاً دورِ کشف، دور فترت اور دور ستر کے تمام حالات کے ماضی اور مستقبل سے وہ آگاہ ہیں۔[۳۰۹] اہل ظاہر کے علماء اسے یہ بتانے سے قاصر تھے کہ نماز پانچ ہی اوقات کیوں فرض کی گئی؟ حروف مقطعات طٰہٰ، حٰم کے کیا مطلب ہیں؟ عرش کے اٹھانے والے آٹھ لوگ کون ہیں؟ جہنم کے سات دروازے کون سے ہیں اور اس کے انیس فرشتوں سے کس بات کی طرف اشارہ مقصود ہے؟ ہاروت و ماروت کا کیا مطلب ہے؟ دجال کی ماہیت کیا ہے؟ قصۂ موسیٰ میں بچھڑا سے کیا مراد ہے؟[۳۱۰] اس قسم کے دسیوں سوالات سے مخاطب پر حیرت و استعجاب کا گہرا تاثر قائم ہوتا۔ اسے یہ بات حیران کن لگتی کہ نماز کی افضلیت کے

باوجود حائضہ کے لیے نماز کی قضا نہیں جبکہ روزے کی قضا کا حکم ہے۔اس کے لیے یہ سمجھنا بھی دشوار تھا کہ بول و براز کے بعد تو طہارت کو کافی سمجھا جائے جب کہ جنابت کے بعد غسل لازم ہو۔آخر کیا وجہ ہے کہ خدا نے کائنات کی تخلیق چھ دنوں میں کی؟ کیا وہ ایک لمحہ میں تخلیق پر قادر نہ تھا؟ ﴿سبع سمٰوات طباقا﴾ اور ﴿سبع من المثانی﴾ کی حکمت کیا ہے؟ ہاتھ پاؤں میں دس دس انگلیاں کیوں ہیں؟ ہر انگلی میں تین پور جبکہ انگوٹھے میں دو ہی کیوں ہیں؟ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ چہرہ میں تو سات سوراخ ہیں جب کہ باقی بدن میں دو ہی سوراخ رکھے گئے ہیں۔

کون پوشیدہ ہے اس پردۂ زنگاری میں

اہل تاویل کا کہنا تھا کہ رموزِ دین سے علمائے ظاہر نا آگاہ ہیں۔ایسا اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اسرارِ دین پر صرف ائمۂ معصومین کو مطلع کیا ہے جو دین کے محافظ ہیں اس لیے دینِ حقیقی سے آگہی اور اس کی پیروی کے لیے لازم ہے کہ مومنین خود کو ائمۂ معصومین کی غیر مشروط اتباع میں دے دیں۔اخوان الصفا جیسے قرآن الائمہ کہے جانے والے رسالے ہوں یا تاویل کی دوسری کتابیں ان سب کا ہدف صرف ایک تھا، وہ یہ کہ حضرت علیؓ اور ان کے فاطمی سلسلۂ نسب کی امامت پر دلیل لائی جائے۔[۳۱۱] مثال کے طور پر المجالس المؤیدیہ کو لیجئے جو کوئی چھے سو[۶۰۰] مجلسوں پر مشتمل ہے یہاں ہر مجلس کا بنیادی ہدف یہ ہے کہ وصایت علیؓ پر باسالیب مختلف دلیل قائم کی جائے۔مجالس مستنصریہ کا لب لباب بھی یہی کچھ ہے ہے جہاں طہارت وصلوٰۃ وغیرہ میں سات فرائض اور بارہ سنتوں کی موجودگی سے امام مستنصر کی طرف اشارہ مراد لیا گیا ہے جو انیسویں امام ہیں کہ بارہ اور سات کا مجموعہ انیس ہوتا ہے۔[۳۱۲]

علم حقیقت کی وہ تمام کتابیں جنھیں اسمٰعیلی اپنے اعلیٰ معارفِ علمی اور علوم باطنی کے سبب باعث افتخار سمجھتے رہے ہیں[۳۱۳] اور جن کی تعلیم حلقۂ خواص کے لیے مخصوص رہی ہے وہاں بھی دانشورانہ گفتگو کا محور و مرکز بس ایک ہی نقطہ ہے وہ یہ کہ لیل و نہار کی گردش ایک ایسے تاریخی سفر سے عبارت ہے جہاں اسمٰعیلی دعوت کے حاملین مسلسل روحانی مدارج طئے کرتے ہوئے ہیکلِ نورانی کی طرف بڑھ رہے ہیں جب کہ ان کے مخالفین (اضداد) اپنے اعمال کے سبب ہر لمحہ صخرہ یا سجّین میں دیئے جانے والے عذاب اکبر کی طرف اپنے قدم بڑھا رہے ہیں۔اسمٰعیلی کونیات (cosmology) اور تنظیمی ڈھانچہ جس پر ہندی، یونانی اور عیسائی چرچ کے تنظیمی ڈھانچے کے اثرات نمایاں ہیں بآسالیب مختلف اس نکتہ کو ذہن نشین کراتی ہے کہ اسمٰعیلی دعوت پر لبیک کہنے والوں کی مثال ایسی ہے گویا۔

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ

کہا گیا کہ اسمٰعیلی دعوت میں داخلہ کے نتیجے میں مستجیب کو امام الزماں کی تائید متصل ہونے لگتی ہے۔یہ نقطۂ نور ہے جو سایہ کی طرح اس کے ساتھ رہتا ہے اور جس کی چمک اعمالِ خیر کے ساتھ مسلسل بڑھتی جاتی ہے۔وفات کے وقت یہ

نقطہ اس کے نفس کے ساتھ متصل ہو جاتا ہے اور پھر یہی نفس متجوہرہ کسی ایسے شخص سے متصل کر دیا جاتا ہے جو روحانی مدارج میں اس سے اعلیٰ ہو۔[۳۱۴] پھر جب یہ مستجیبِ اعلیٰ وفات پا جاتا ہے تو ان دونوں کے نفسِ متجوہرہ اپنے سے اعلیٰ مستجیب کے نفس سے متصل ہو جاتے ہیں۔ نفوس کے اس قسم کے مجمع کو ہیکلِ نورانی کہتے ہیں۔ پھر یہ سب کچھ مختلف تدریجی مراحل سے گزرتے ہوئے، جن کا طول طویل بیان ان کتابوں میں پایا جاتا ہے، کسی میوے، پھل یا پاکیزہ پانی کی شکل میں متشکل ہوتے ہیں۔ امام اور ان کی پاکیزہ بیوی جب اس پھل یا پانی کو استعمال کرتے ہیں تو زوجۂ طاہرہ کے ہاں یہ نطفہ جمع ہوتا ہے اور اس طرح امامِ نومولود کے نفس سے طیب نفوس کے اتصال کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ یہ بھی کہا گیا کہ اماموں کی بیویاں ایامِ حیض میں مبتلا نہیں ہوتیں جیسا کہ اس خیال کے مطابق ﴿انما یرید اللہ لیذھب عنکم الرجس و یطھرکم تطھیرا﴾ سے ظاہر ہے۔

رہے وہ لوگ جنھوں نے اسمٰعیلی دعوت کا انکار کیا تو ان کے برے اعمال صورت ظلمانیہ کی شکل میں متشکل ہوتے ہیں جو بوقتِ وصال اس کی وحشت کا سبب بنتے ہیں۔[۳۱۵] یہ صورتِ ظلمانی کبھی خلا میں بھٹکتی ہے اور کبھی انسانوں میں داخل ہو کر اسے وساوس میں مبتلا کرتی اور گناہوں پر آمادہ کرتی ہے۔ یہی ظلمانی صورتیں کبھی شیاطین اور عفریت کی شکل اختیار کرتی ہیں[۳۱۶] اور کبھی تنین کی طرف سے ان ظلمت گاہوں کا سفر کرتی ہیں جنھیں خبیث روحوں کے مرکز کی حیثیت حاصل ہے۔[۳۱۷] پھر ان ہی میں سے بعض ظلمانی صورتیں زمین کی طرف اترتی ہیں جہاں یہ غذا کی شکل میں متشکل ہوتی ہیں اسے کھانے والے لوگ ایسی اولادوں کو جنتے ہیں جو انبیاء اوصیاء اور ائمہ کی مخالفت میں پیش پیش ہوتے ہیں۔ بسا اوقات ائمہ کی لعنتوں کے نتیجے میں بھی ایسے لوگ پیدا ہوتے ہیں جو لوگوں کے اعمال کے نتیجے میں ان پر مسلط کئے جاتے ہیں جیسا کہ حجاج بن یوسف، جو اس خیال کے مطابق، حضرت علیؓ کی لعنتوں کے نتیجے میں اہل عراق پر مسلط کیا گیا تھا۔ ائمہ کے مخالفین (اضداد) موت کے بعد جب مٹی میں مل جاتے ہیں تو وہ آبخارات بن کر اوپر چڑھتے اور پھر عذاب کی بجلیوں اور ہلاک کرنے والی بارش کی شکل میں نیچے آتے ہیں۔ پھر وہ نباتات و حیوانات کی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں اور ان انسانوں کی غذا بنتے ہیں جن میں قبولِ حق کی کچھ بھی صلاحیت نہیں ہوتی جیسے زنج، بربر اور ترک قومیں۔ پھر یہ ستر قالب بدلتے ہوئے مختلف جانوروں، پرندوں اور ہولناک حیوانوں کی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں یہاں تک کہ قائم اسے اپنے ہاتھ سے ذبح کر ڈالیں۔ پھر یہ آگ میں جل کر بخارات کی شکل میں عقدتان میں پہنچتے ہیں۔ ان کی آخری منزل صخرہ یا سجّین ہے جو کرۂ زمین کے عین وسط میں واقع ایک ایسی جگہ ہے جو ائمہ کے مخالفین پر عذاب کے لیے مخصوص کی گئی ہے۔[۳۱۸]

ان معارف و مفروضات کی علمی حیثیت سے قطع نظر تاویل وحقائق کی کتابوں نے کمال حکمت کے ساتھ سیاسی

پروپیگنڈے کو مذہب اور فلسفہ کی زبان عطا کر دی۔ بلکہ یہ کہیے کہ دین اور فلسفہ کو خلافتِ فاطمیہ کی نظری خدمت پر مامور کر دیا۔ رسولؐ اللہ سے منسوب ایک حدیث ان اللہ اسّس دینہ علی مثال خلقہ لیستدل بخلقہ علی دینہ و بدینہ علی توحیدہ کی بنیاد پر اسمٰعیلی داعیوں نے سات افلاک، سات سیارے اور بارہ برجوں کے مقابل سات نطقاء، سات ائمہ اور بارہ نقباء پر دلیل قائم کی اور اس خیال کا اظہا کیا کہ مدبّر عالم عقل عاشر نے زمین کو مرکز قرار دیتے ہوئے اس کے گرد دوسرے افلاک کو گردش دی۔ حقائق کی کتابوں میں میزان الدیانہ کی بنیاد بطلیموسی نظام پر رکھی گئی۔[۳۱۹] کہا گیا کہ عاشر مدبّر نے سات سیارے بنائے جن میں صرف چاند تاریک ہے اور باقی اپنے ذاتی نور سے چمکتے ہیں۔ کائنات کا یہ قدیم تصور جس پر اسمٰعیلی حقائق کی بنیادیں اٹھائی گئی تھیں اور میزان الدیانہ کی ترتیب عمل میں آئی تھی ہمارے تصور کائنات کی تبدیلی کے ساتھ ہی ساقط الاعتبار ہو گیا۔ البتہ مابعد الطبیعاتی مسائل نے علوم ناموسیہ شرعیہ کی جو گرد اٹھائی تھی اس نے آنے والی صدیوں میں اسمٰعیلی حلقوں سے باہر بھی عالم بالا کے شائقین کو طرح طرح کے التباسات میں مبتلا رکھا۔

اسمٰعیلی دعوت بنام باطنی خلافت

فاطمی خلافت کے خاتمے اور منگولوں کے ہاتھوں ۱۲۵۶ء میں قلعہ الموت کے سقوط کے بعد اسمٰعیلی دعوت تصوف کے قالب میں پناہ لینے پر مجبور ہوئی۔ گو کہ صوفی خرقہ میں اسمٰعیلی داعیوں کی چلت پھرت کا معاملہ تاریخ میں پہلی بار پیش نہ آیا تھا کہ اس سے پہلے بھی تاجروں اور اہل تصوف کے نقاب میں اسمٰعیلی داعیوں کا مختلف علاقوں میں متحرک رہنا تاریخ سے ثابت ہے۔ دسویں صدی میں جب اسمٰعیلی خلافت اپنے نصف النہار پر تھی سندھ اور ہند کے دور دراز علاقوں میں صوفیاء کے روپ میں اسمٰعیلی داعی وارد ہو چکے تھے۔[۳۲۰] البتہ سقوطِ الموت کے بعد نزاری اسمٰعیلیوں نے تصوف کو اپنے نظری قالب کا حجاب بنایا اور خاموش زیرزمین سرگرمیوں کے لیے پہلی بار طرق یا سلسلوں کی بنیاد ڈالی اور اس طرح دیکھتے دیکھتے خانقاہوں اور مزاروں کے پردے میں سہروردیہ، چشتیہ اور نعمت اللّٰہی ناموں سے دعوت کی بین الاقوامی تنظیم کا ایک زبردست جال بچھ گیا۔ ظاہری خلافت یا اقتدار کے خاتمہ سے دعوتِ اسمٰعیلیہ کو جو نقصان پہنچا تھا اب تصوف کے پردے میں باطنی خلافت کے قیام نے ان محرومیوں کا بڑی حد تک ازالہ کر دیا۔[۳۲۱] بلکہ بعض اعتبار سے باطنی خلافت کہیں زیادہ موثر ثابت ہوئی کہ اب جو لوگ سادات کے حوالے سے روحانی حکومت کے دعویدار تھے، اور جن کے آگے معتقدین کی جبینِ نیاز جھکی ہوئی تھی، ان کی اس روحانی سلطنت کو چیلنج کرنے والا کوئی نہ تھا اور نہ ہی کسی میں

یہ دم خم تھا کہ وہ پیر کی نسبی عظمت، تفضیلِ علیؓ، پنجتن یا شریعت کی تحقیر اور طریقت وحقیقت کی فضیلت پر ان سے سوال کر سکتا۔ علیؓ اب قلندروں میں سب سے بڑے قلندر سمجھے جاتے جن کے نسبی رشتے اور باطنی شاگردی جسے یہ حضرات علم لدُنّی کہتے تھے، کے سبب پیر کو دینی اور روحانی زندگی کا سربراہ سمجھا جاتا اور جن سے بیعت کے بغیر اہل ایمان کی روحانی زندگی تشنگی کا احساس لیے رہتی۔

تصوف کے پردے میں اسمٰعیلی دعوت کی غیر معمولی کامیابی کا ایک سبب تو یہ تاریخی پسِ منظر تھا جہاں خفیہ اور زیر زمین تنظیم سازی شروع سے ہی اس کے مزاج کا ایک حصّہ بن گئی تھی۔ ثانیاً اہل تصوف کا یہ دعویٰ کہ ان کی دعوت غایتِ دین کی گہری معنویت سے عبارت ہے، ان کا تصورِ توحید اہل ظواہر سے بہت آگے کی چیز ہے، ان ہی معانی کی طرف اشارہ کرتے تھے جس کے محرمِ راز ہونے کا دعویٰ اسمٰعیلی داعیوں کو بھی تھا۔ ہمارے لیے یہ کہنا تو مشکل ہے کہ خانقاہوں اور زاویوں کے قیام میں یا تصوف کو ایک مستقل دینی قالب عطا کرنے میں اسمٰعیلی دعوت کا رول کتنا ہے۔ البتہ اگر تیسری اور چوتھی صدی میں عالم اسلام کا سیاسی اور سماجی منظر نامہ اپنی تمام تر جزئیات کے ساتھ متصور کرنا ممکن ہو تو ہم اہل صفا کے لبادے میں متحرک کرداروں کے اصل عزائم کا کسی حد تک اندازہ کر سکتے ہیں۔

دعوتِ عباسیہ کے نقیب ہوں یا اسمٰعیلی دعوت کے حاملین، یہ جس خطرناک سیاسی ماحول میں ایک نئی امامت کی تحریک چلا رہے تھے وہاں افشائے حال کی صورت میں اس کی سزا موت سے کم نہ تھی۔ دعوتِ عباسیہ کے نقباء نے اپنی بعض قیمتی جانوں کے اتلاف کے بعد مرکز سے دور خراسان کو اپنا مرکز بنایا۔ عباسی حکومت کے قیام کے بعد الرضا من آلِ محمدؐ کے انتخاب پر اہل خراسان کو دھوکے کا احساس ہوا۔[۳۲۲] یہاں تک کہ ابومسلم خراسانی جیسے کلیدی داعی کو خود عباسیوں کے ہاتھوں موت کا سامنا کرنا پڑا، اس صورت حال نے ان لوگوں کو زیر زمین پناہ لینے پر مجبور کر دیا جو السّفاح کے برسر اقتدار آنے سے خوش نہ تھے۔ آلِ عباس کے عین حکمرانی کے اندر فاطمی دعوت کی زیر زمین توسیع اور بالآخر افریقہ میں اس کا ظہور اسی سیاسی بے چینی اور نظری تشنگی کے سبب تھا جس کے مطابق خلافت کے اصل سزاواروں کا ابھی ظہور میں آنا باقی تھا۔ ابتداء سے ہی اسمٰعیلی داعیوں نے اپنی تحریک پر سرّیت کا دبیز حجاب قائم رکھا حتیٰ کہ ابتدائی تین ائمہ، جنھیں ائمۂ مستور کہا جاتا ہے عام تاجروں کے بھیس میں سلامیہ اور شام کے بازاروں میں پھرا کرتے۔[۳۲۳] یہی حال بعض کبار اسمٰعیلی داعیوں کا تھا جنھوں نے اپنے اصل عزائم پر تجارت کی قبا ڈال رکھی تھی۔[۳۲۴] خراسان جہاں سے عباسی تحریک شروع ہوئی، آلِ بیت کے ہمدردوں کا مرکز بن گیا تھا لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ دوسرے بلاد و امصار میں آلِ بیت کے ہمدردوں کا حلقہ نہ تھا۔ اموی حکومت کی بساط جس طرح لپیٹی گئی اور جس طرح بنوامیہ کا خون حلال ہوا اس سے بھی تحریکِ آلِ بیت کے وسیع البنیاد اثرات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ایسی صورت میں حلقۂ آلِ بیت سے ایک نئی تحریک

کی آبیاری عوامی سطح پر کچھ مشکل کام نہ تھا۔ ہاں نظامِ وقت کی نگاہوں سے اسے پوشیدہ رکھنا اس کی توسیع اور کامیابی کی بنیادی ضمانت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ قاہرہ میں فاطمی خلافت کے ظہور کے بعد بالکل ابتدائی مراحل میں مختلف بلاد و امصار میں جو داعی بھیجے گئے انھوں نے خود کو اہل صفا کے قالب میں پیش کیا۔ منگول حملوں سے قبل جب تصوف میں طرق کا سلسلہ وجود میں نہیں آیا تھا اس بات کا پتہ چلنا مشکل تھا کہ کس صوفی کے سیاسی رجحانات کیا ہیں؟ کہ تب عام طور پر حکمران صوفی کا سرپرست ہوتا اور صوفیوں کے عوامی رابطے اور روحانی برتری کے دعوے سلاطین کی حکمرانی کو استناد فراہم کرتے۔ البتہ منگول حملوں کے بعد جب عالمِ اسلام پر قیامت صغریٰ برپا تھی، مسلمانوں کی باہمی خانہ جنگی میں اسمٰعیلیوں کو مختلف گروہوں کے عتاب کا نسبتاً کہیں زیادہ سامنا تھا، تصوف ان کے لیے ایک آسان حجاب اور فطری قالب کے طور پر سامنے آیا۔

جیسا کہ ہم نے بتایا بغداد اور الموت کی تاراجی سے پہلے تصوف طرق یا سلسلوں کی شکل میں متشکل نہ ہوا تھا۔ غزالی کی پرزور حمایت نے تصوّف کو دین کے ایک معتبر اور متبادل قالب کے طور پر متعارف تو ضرور کرا دیا تھا البتہ حنفی، شافعی یا حنبلی کی طرح قادری، چشتی جیسے لاحقوں کا رواج نہ ہوا تھا۔ تیرہویں صدی میں جب سخت نامساعد حالات کے تحت اسمٰعیلی دعوت نے تصوف کا قالب اختیار کیا تو ان کی فطری تنظیمی صلاحیتوں اور داعیانہ اولوالعزمی نے طرق و سلسلوں کی طرح ڈال دی۔ ابتدائے عہد کے صوفیاء مثلاً حسن البصری (متوفی ۱۱۰ھ)، عبدالواحد بن زید (متوفی ۱۷۶ھ)، ابراہیم بن ادہم (متوفی ۱۶۲ھ)، فضیل بن ایاز (متوفی ۱۸۷ھ) کو کبھی اپنے متبعین کو سلسلوں میں منسلک کرنے یا انھیں باطنی خلافت سونپ کر دور دراز علاقوں میں بھیجنے کا خیال بھی نہ آیا تھا۔ اسمٰعیلی مشن پر مامور صوفیاء میں جنھیں دور دراز کے علاقوں میں توسیعِ دعوت کے لیے بھیجا گیا غالباً سب سے پہلا نام ابواسحاق شامی (متوفی ۳۲۹ھ) کا ہے جنھیں چشت بھیجا گیا تھا اور جنھیں چشتی سلسلے کا بانی مبانی قرار دیا جاتا ہے۔ ابواسحاق شامی کی اسمٰعیلی شناخت پر گو کہ سرّیت کا پردہ پڑا ہے لیکن جو لوگ چشتی سلسلے کی اصل حقیقت سے واقف ہیں ان کے لیے اس بات کا اندازہ کرنا چنداں مشکل نہیں کہ فاطمی خلافت کے عہد میں شامی جیسے نہ جانے کتنے اسمٰعیلی داعی دور دراز کے علاقوں میں دعوت کی توسیع کے کام میں مصروف تھے۔ یہ ان ہی داعیوں کی سعی بلیغ کا نتیجہ تھا کہ عہدِ فاطمی میں ملتان جیسے دور دراز علاقے میں فاطمی خلیفہ کا خطبہ پڑھا جاتا تھا۔

تیرہویں صدی میں اسمٰعیلی داعیوں کو بڑے پیمانے پر تصوف کا قالب اختیار کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی کہ اب اس بدلی ہوئی صورتِ حال میں اپنی نظری شناخت کو پوشیدہ رکھنے اور اس کی مسلسل توسیع کے لیے یہ واحد مؤثر اسٹریٹجی رہ گئی تھی۔ اسمٰعیلیوں کے علاوہ بعض امامی شیعہ گروہوں نے بھی اہل تصوف کے لبادے میں اپنے عزائم کی تنظیمِ

نو کی کوشش کی۔ مثال کے طور پر نور بخشیہ اور صفویہ سلسلوں کو لیجئے جو بظاہر تو شیعہ صوفیوں کا گروہ تھا جن کا مقصد تفضیلِ علیؓ کی تبلیغ تھا لیکن ان کے سیاسی عزائم انھیں براہِ راست تیموریوں سے ٹکّر لینے پر آمادہ کرتے رہے جس کے سبب ان کے ایک شیخ اسحاق الختلانی اوران کے مریدوں کو بغاوت کے جرم میں ۸۲۶ھ میں تیموریوں کے ہاتھوں زندگی گنوانی پڑی۔ نور بخشیہ کے سیاسی عزائم میں ایک شیعی ریاست کا قیام تھا لیکن تصوف کے پردے میں وہ ایک ایسے اسلام کے داعی رہے جہاں سنّی شیعہ سرحدیں اپنی معنویت کھو دیتی ہوں۔ کہا جاتا ہے کہ نور بخش جو بظاہر صوفی تھے اپنے سیاسی عزائم کے سبب شاہ رخ کے حکم پر گرفتار اور جلا وطن ہوئے۔[۳۲۵] ایک اور صوفی سلسلہ جس نے پندرہویں صدی کے ایران و خراسان اور آگے چل کر ہندوستان میں سنّی صوفی سلسلہ کی حیثیت سے زبردست مقبولیت حاصل کی، شاہ نعمت اللہ ولی کا نعمت اللٰہی سلسلہ تھا جس نے علیؓ کی روحانی ولایت اور اس سے نسبت کو صوفی شیخ کے لیے لازم وملزوم قرار دیا۔ نعمت اللٰہی سلسلے کے بزرگ اپنے ناموں کے ساتھ شاہ لگاتے ہیں جو اگر ایک طرف ان کے محمد بن اسمٰعیل سے نسبی تعلق پر دال ہے تو دوسری طرف گویا اس بات کا اشارہ بھی کہ صوفی پیر کے بھیس میں دراصل اسمٰعیلی امام وقت نے پناہ لے رکھی ہے[۳۲۶] اور جن سے نزاری اماموں کے تعلق کا معاملہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ اسمٰعیلی داعیوں نے اپنے سیاسی زوال کی بڑی حد تک تلافی باطنی خلافت کے استحکام کے ذریعہ کرلی اور اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ ان کی اس وسیع الاطراف دعوت سے دین کی دعوت ان علاقوں میں پہنچ گئی جہاں سیاسی حالات انتہائی نامساعد بلکہ ناقابل نفوذ تھے۔ لیکن یہ اس سے بھی کہیں زیادہ تلخ حقیقت ہے کہ دین کا یہ تصور جو ان صوفیاء کے ذریعے لوگوں تک پہنچا وہ دین کی غلو آمیز اسمٰعیلی تعبیر تھی جس کی بنیاد تفضیلِ علیؓ، پنجتن، ہمہ اوست اور تصرفاتِ نگہ پیرِ علوی پر رکھی گئی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام کے مقبولِ عام تصور میں اسمٰعیلی عقائد کچھ اس طرح رچ بس گئے کہ علماء کے لیے ان خیالات کی راست تطہیر کے بجائے اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہ رہا کہ وہ انھیں تفرّدات اور شطحیات کی حیثیت سے قبول کرلیں۔

اہل تصوّف کی سیاسی وابستگی کے سلسلے میں ہمارے تاریخی مصادر میں بہت زیادہ معلومات نہیں ملتی اس لیے ہمارے لیے یہ کہنا مشکل ہے کہ صوفیاء کے مختلف سلسلے زیرزمین کن سیاسی ایجنڈوں پر کام کررہے تھے۔ ہوسکتا ہے بعض چھوٹے موٹے سلسلے محض بڑے سلسلوں کی اتباع میں متشکل ہوئے ہوں اور ان کے بانیان یا تنظیم کاروں کے ذہنوں میں خلافت وامامت کے قیام کا کوئی اولوالعزم تصور نہ ہو۔ البتہ سہروردی اور چشتی سلسلے کی چلت پھرت پر اسمٰعیلی وابستگی کا احساس خاصا نمایاں ہے۔[۳۲۷] مودود چشتی (متوفی ۵۲۷ھ) جنھیں برصغیر میں سلسلۂ چشتیہ کا اہم بزرگ سمجھا جاتا ہے اور جن سے عثمان ہارونی، معین الدین چشتی، بختیار کاکی اور فریدالدین گنج شکر جیسے کبار ائمہ صوفیا کے نام وابستہ ہیں، یہ

سب کے سب دراصل اسمٰعیلی داعی تھے جو اپنے اپنے علاقوں میں دعوت کی خدمت پر مامور تھے۔ سندھ و پنجاب میں دعوت کا سب سے منظّم کام جن لوگوں نے انجام دیا وہ اسمٰعیلی داعی تھے جن کی محنت بالآخر فاطمی خلافت کے جزیروں کی شکل میں ملتان اور منصورہ میں طلوع ہوئی لیکن ابھی کچھ زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ اولاً محمود غزنوی نے اور کوئی اس کے ڈیڑھ سو سال بعد محمد غوری نے اسمٰعیلی ریاست کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔[۳۲۸] دسویں صدی عیسوی کے وسط سے بارہویں صدی کے وسط تک قاہرہ اور الموت قوت کے علامیہ کے طور پر دیکھے جاتے تھے لیکن جب فاطمیوں کو زوال آ گیا تو پھر انھیں غزنوی، غوری، سلجوقی، ایوبی اور پھر منگولوں کی مشترکہ مقاومت کا سامنا کرنا پڑا۔ ایسی صورت میں ان اسمٰعیلی داعیوں کے لیے اپنے سیاسی عزائم پر پردہ ڈالے رکھنا اسٹریٹجی کا حصہ تھا۔ مسعود غزنوی کے عہد میں علی بن عثمان ہجویری (داتا گنج بخش) لاہور میں وارد ہوئے لیکن ان سے کوئی تعرض نہ کیا گیا کہ ایسا سمجھا جاتا تھا کہ اہل صفا بالعموم سیاسی وابستگیوں سے بالاتر ہوتے ہیں۔ تیرہویں صدی کے ہندوستان میں اس عہد کے چار کبار صوفیاء اپنے باہمی رابطے اور گہرے تعلق کے سبب چار یار کہلاتے تھے جن میں فریدالدین گنج شکر (متوفی ۱۲۶۶ء) نزیل پاک پٹن، جلال الدین بخاری (متوفی ۱۲۹۴ء) نزیل اُچ، بہاولپور، بہاءالدین ذکریا (متوفی ۱۲۶۷ء) نزیل ملتان اور لال شہباز قلندر (متوفی ۱۲۷۴ء) نزیل سہون کے نام شامل ہیں۔ آخرالذکر شہباز قلندر کی اسمٰعیلی شناخت ہر خاص و عام پر واضح ہے جس سے بقیہ تین یاروں سے ان کے تعلق اور ان کی اصل نظری شناخت کا بہت کچھ اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

سندھ و ہند کے علاقوں میں صوفیاء کی اسمٰعیلی وابستگی کا ایک اور ثبوت یہ ہے کہ برصغیر کی حد تک جو صوفی دہلی، اجمیر، ملتان، پنجاب وغیرہ میں وارد ہوئے وہ نہ صرف اسی عہد میں آئے جب اسمٰعیلی دعوت عروج پر تھی بلکہ شمالی ہند میں اپنی آمد سے پہلے ملتان کی فاطمی ولایت میں ان حضرات کی خاصی آؤ بھگت ہوتی رہی۔[۳۲۹] مثلاً خواجہ معین الدین اجمیری اور قطب الدین بختیار کاکی اجمیر اور دہلی میں اپنی نامزدگی سے پہلے ایک طویل عرصے تک ملتان کی اسمٰعیلی ولایت میں مقیم رہے۔ کچھ عجب نہیں کہ آج ہم جن لوگوں کو محبوب الٰہی اور سلطان الہند کی حیثیت سے جانتے ہیں اور جن کے فیوض و برکات سے آج بھی اجمیر، دہلی، ملتان اور لاہور کی سرزمین لطف اندوز ہو رہی ہے، وہ دراصل اسمٰعیلی دعوت کے پرجوش مبلغ رہے ہوں۔

برصغیر ہند و پاک ہی کیا عالم اسلام کے بیشتر صوفی مقابر، خانقاہیں اور گمنام اصحابِ کرامت کی قبریں جہاں صدیوں سے خلائق کا ہجوم ہے فی الواقع اسمٰعیلی دعوت کے خاموش زیرِ زمین مراکز رہے ہیں۔[۳۳۰] حتیٰ کہ تصوف کی بیشتر اصطلاحیں مثلاً پیر، مرید، شریعت، طریقت، باطن اور ظاہر وغیرہ ان ہی حضرات کی وضع کردہ ہیں۔ منگول حملوں کے بعد جب پوری اسلامی دنیا تاخت و تاراج ہوگئی، اسمٰعیلیوں نے اپنی دعوت کے نظام کو ان صوفی سلسلوں کے پردے

میں منظّم کیا۔ صوفی سلسلوں کے قیام سے اسمٰعیلی دعوت کے استحکام میں غیر معمولی کامیابی ملی۔ نہ صرف یہ کہ تفضیلِ علیؓ اور پنجتن کا عقیدہ عامۃ الناس میں سرایت کر گیا بلکہ صوفیاء نے مردہ پیروں اور قلندروں کے مفروضہ کشف و کرامات کے سلسلے کو حضرت علیؓ سے جا ملایا۔ قلندروں میں علیؓ پہلے نمبر پر فائز کئے گئے اور اصحاب کرامت کی مختلف قبروں کو ان ہی کے فیض کا تسلسل قرار دیا گیا۔ شریعت اور معرفت کی ثنویت کا خیال عام ہوا اور اس طرح جمہور مسلم فکر میں اسمٰعیلی عقائد نے ہمیشہ ہمیش کے لیے اپنی جگہ بنالی۔

یقیناً اسمٰعیلی داعیوں کی یہ غیر معمولی کامیابی ہے کہ وہ صدیوں کی جانگسل جدوجہد کے دوران نہ صرف یہ کہ مختلف حکومتوں کے قیام میں کامیاب ہوئے، دنیا کے مختلف علاقوں میں، تاریخ کے ہر دور میں مخالفین سے نبرد آزما رہے بلکہ ان کے خفیہ دعوتی نظام نے سوادِ اعظم کے اسلام کا قالب بھی تبدیل کر ڈالا۔ حتیٰ کہ تہذیب واخلاق، روحانیت اور شاعری کی وہ عظیم کتابیں جنھیں عالم اسلام میں صدیوں سے قبولیت عامہ حاصل ہے اور جنھیں آج بھی مذہبی ذہن احترام کی نگاہ سے دیکھتا ہے، ان کی ترتیب وتدوین میں بھی اسمٰعیلی اہل فکر نے اہم رول انجام دیا ہے۔ مثال کے طور پر مولانا جلال الدین رومی کو لیجئے جن کا سکہ کوئی سات سو سالوں سے عالم اسلام میں چل رہا ہے۔ ان کی مثنوی اپنی تمام تر شعری خوبیوں کے باوجود بنیادی طور پر اسی باطنی ذہن کی تعمیر کی کوشش ہے جس سے مولانا رومی کا قلبی تعلق ہے۔ بہتوں کے لیے یہ بات شاید حیرت واستعجاب کا باعث ہو کہ مثنوی کا روحانی ہیرو شمس تبریز جس کی شخصیت پر صدیوں سے سرّیت کا پردہ پڑا رہا ہے دراصل اسمٰعیلی امام شمس الدین کی ذات ہے۔ کہا جاتا ہے کہ قلعۂ الموت کے سقوط کے بعد شمس الدین محمد جو الموت کے آخری حکمراں رکن الدین خورشاہ (متوفی ۶۵۵ھ) کے بیٹے اور ولی عہد تھے، اپنی جان بچا کر آذربائجان کی طرف نکل آئے۔ شمس الدین نے زردوزی کا بھیس اختیار کیا اور اپنی اصل شخصیت پر پردہ ڈالے رہے۔[۳۳۱] رومی جب شمس تبریز کو ایک مجذوب زردوزی کی حیثیت سے متعارف کراتے ہیں تو دراصل وہ اس پردے میں اپنے امام وقت کو خراج عقیدت پیش کر رہے ہوتے ہیں جن کے روحانی وجود سے ان کی شاعری حرارت حاصل کرتی ہے۔

علم باطن ہمچو مسقہ، علم ظاہر ہمچو شیر
کے بود شیر مسقہ، کے بود بے پیر پیر

ابن عربی جنھیں تصوف کے شیخ اکبر کی حیثیت سے متصوفین کے دل ودماغ پر غیر معمولی تصرف کا اختیار حاصل رہا ہے ان کے تصور کائنات پر اسمٰعیلی التباساتِ فکری کے اثرات خاصے نمایاں ہیں۔ ہمہ اوست کا فلسفہ ہو یا ظاہر وباطن کی عقدہ کشائی، عالم لاہوت وجبروت اور ملکوت وناسوت کا ذکر ہو یا تنزلات اور حقیقت محمدیہ کا حلولی بیان، ان

التباسات پر اخوان الصفا اور علم حقیقت کی دوسری اسمٰعیلی کتابوں کی جھلک بآسانی دیکھی جاسکتی ہے۔[۳۳۲] بکمال احتیاط اتنا تو کہا ہی جاسکتا ہے کہ ابن عربی کا تصورِ حیات ان ہی تصورات کی نمو یافتہ اور منظّم شکل ہے۔ آیاتِ قرآنی کی تاویل میں ابن عربی نے اپنے اسمٰعیلی ائمہ سے بھرپور اکتساب کیا ہے۔ مثال کے طور پر ﴿والتین والزیتون وطور سینین وھذا البلد الامین﴾ کو لیجئے۔ امام المعز کی تاویل کے مطابق تین باطن کے مثل ہے کہ اس کا چھلکا نہیں ہوتا جو اسے چھپائے اس کے برخلاف انار ظاہر کے مثل ہے کہ اس کا مغز چھلکے میں چھپا ہوتا ہے۔ ابن عربی نے ہو بہو اسی باطنی منہجِ تاویل کی پیروی کی ہے۔ کہتے ہیں تین سے مراد معانی کلیہ ہیں کہ اس میں گٹھلی نہیں ہوتی مغز ہی مغز ہوتا ہے۔ زیتون سے مراد معانی جزئیہ ہیں کہ اس میں گٹھلی ہوتی ہے۔ طور سینین سے مراد دماغ ہے جو جسم سے اسی طرح بلند ہے جس طرح زمین سے پہاڑ۔ بلد الامین قلب کی طرف اشارہ ہے جو معانی کلیہ کا محافظ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان چیزوں کی قسم اس لیے کھائی ہے کہ ان کے سبب انسان کو کمال حاصل ہوتا ہے اور یہی سبب ہے کہ ان علامتی امور کے بیان کے بعد لقد خلقنا الانسان فی احسنِ تقویم کی آیت کے لائے جانے کا۔ مغز اور چھلکے کی یہ باطنی تاویل امام المعز کی تاویل سے بڑی مشابہت رکھتی ہے۔ ابن عربی نے جس طرح قرآن مجید کو مغز اور چھلکے یا ظاہر و باطن کے paradigm میں پڑھنے کی کوشش کی ہے اسے اگر اسمٰعیلی تاویل و حقائق کے تناظر میں دیکھا جائے تو یہ تاثر گہرا ہوتا جاتا ہے کہ ان کی دانشوری میں اسمٰعیلی مسلک کا ہاتھ ہو یا نہ ہو ان کے دائرۂ فکر کی تشکیل میں تاویل و حقیقت کی کتابوں نے اہم رول انجام دیا ہے۔

اسمٰعیلی دانشوری نے تصوف و اخلاق کی کتابوں پر جتنا گہرا اثر مرتب کیا ہے اس کے پیشِ نظر بسا اوقات یہ کہنا مشکل ہے کہ ان کتابوں کے لکھنے والے عقیدتاً اسمٰعیلی تھے یا انھوں نے تصوف کے زیرِ اثر اسمٰعیلی تصورِ حیات کو غیر محسوس طور پر اپنے ہاں جگہ دے دی ہے۔ مثال کے طور پر سعد الدین شبستری (متوفی ۷۱۰ھ) کی مشہور مثنوی گلشنِ راز کو لیجئے جو اہل تصوف کے حلقے میں ایک متداول کتاب کی حیثیت سے گردش کرتی رہی ہے اور جس کی مختلف صوفیاء نے شرحیں بھی لکھی ہیں۔ محمد شاہی نزاری امام شاہ طاہر کی شرح گلشنِ راز کا مطالعہ اس راز سے پردہ اٹھاتا ہے کہ گلشنِ راز کا مصنف فی الاصل ایک اسمٰعیلی صوفی ہے جس نے بڑی کامیابی کے ساتھ اس نظم کو اپنے نظریات کی تبلیغ کا ذریعہ بنایا ہے۔[۳۳۳] اسمٰعیلی حلقوں میں فرید الدین عطّار (متوفی ۶۲۷ھ)، جلال الدین رومی (متوفی ۶۷۲ھ)، عزیز الدین نسفی (متوفی ۶۶۱ھ) اپنی اصل اسمٰعیلی شناخت کے ساتھ دیکھے جاتے رہے ہیں۔ رومی کی اسمٰعیلی وابستگی امام شمس الدین کے تئیں ان کے مریدانہ والہانہ اظہار بیان سے نمایاں ہے۔ فرید الدین عطّار اپنے پند نامہ کے سہارے صدیوں سے سنّی ذہن کی تعمیر میں ایک اہم عامل کا کردار ادا کرتے رہے ہیں اور نسفی کی زبدۃ الحقائق کو وسط ایشیاء کے اسمٰعیلی

علمی سرمایے میں نمایاں مقام کا حامل سمجھا جاتا ہے۔اس کے علاوہ جن اسمٰعیلی مصنفین نے جمہور مسلم ذہن کی تشکیل میں نمایاں رول ادا کیا ہے ان میں نصیرالدین طوسی کی اخلاقِ ناصری کو نمایاں مقام حاصل ہے۔ کہا جاتا ہے کہ نصیرالدین طوسی جنھوں نے بعد میں اثنا عشری شیعیت اختیار کر لی تھی، ایک طویل عرصے تک اسمٰعیلی حکمراں ناصرالدین عبدالرحمٰن بن ابی منصور (متوفی ۶۵۵ھ) کے دربار سے وابستہ رہے تھے اور اسی دوران انھوں نے اخلاق ناصری تصنیف کی تھی اور یہ کہ اس کے پہلے ایڈیشن میں اسمٰعیلی طرزِ فکر کا حامل ایک پیش لفظ بھی شامل تھا۔ نصیرالدین طوسی کی ایک اور تصنیف روضة التسلیم سے بھی ان کا سابقاً اسمٰعیلی ہونا ثابت ہوتا ہے۔ طوسی کی شہادت کو اگر درست تسلم کیا جائے تو یہ ماننے بغیر چارہ نہیں رہتا کہ سنّی اشعری فکر کے اساطین میں سے ایک نمایاں عالم دراصل درونِ خانہ اسمٰعیلی عقائد کے حامل تھے۔ اپنی روحانی خودنوشت سیر و سلوك میں طوسی نے لکھا ہے کہ شہرستانی کوئی عام اسمٰعیلی نہ تھے بلکہ وہ اسمٰعیلی نظامِ دعوت میں داعی الدعاۃ کے منصب پر فائز تھے۔[۳۳۴] شہرستانی کی بعض تصانیف مثلاً تفسیر مفاتیح الاسرار اور مصارعة الفلاسفه سے ان کی اسمٰعیلی وابستگی یا اثرات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ حکیم نزاری برجندی کوہستانی (متوفی ۷۲۰ھ) جو ایک کھلے عام اسمٰعیلی شناخت کے ساتھ چلتے پھرتے نظر آتے ہیں، گلشنِ راز کے مصنف شبستری اور معروف فارسی شاعر شیخ سعدی کے حلقۂ احباب میں تھے۔ تو کیا سعدی جن کے زبان زد عام شعری مجموعے گلستاں، بوستاں صدیوں سے ہماری درسگاہوں میں رائج رہے ہیں درپردہ اسمٰعیلی تھے؟ ہمارے پاس اس بارے میں وافر ثبوت نہیں اور نہ ہی سردست یہ ہماری گفتگو کا محور ہے۔ البتہ شعر و ادب کے ایک طالب علم کی حیثیت سے اس خیال کو یکسر مسترد کرنا بھی ممکن نہیں۔ خاص طور پر جب سعدی کی شاعری میں اس خیال پر اندرونی شہادت موجود ہو:

خدایا بحقِ بنی فاطمہ — کہ برقول ایمان کنم خاتمہ
اگر طاعتم رد کُنی در قبول — من و دست و دامانِ آلِ رسول

اسمٰعیلی مفکرین اور داعیوں کے ہاتھوں اہل تصوف کی تقلیبِ نظری کی ایک اور ناقابل تردید مثال وِفق ونقوش کی مقبولیت ہے جسے مسلمانوں کے تمام ہی فرقوں نے کسی نہ کسی سطح پر قبول کر رکھا ہے۔ وفق ونقوش کا سارا کاروبار بنیادی طور پر ابتدائی غلاۃ شیعہ کے ان تصورات کی نمو یافتہ شکل ہے جن کے مطابق یہ سمجھا جاتا تھا کہ خدا نے دنیا کی تخلیق حروف کے ذریعہ کی ہے۔ ان کے نزدیک کُن فیکون کا عمل اس خیال سے عبارت تھا کہ عربی کے حروف تہجی اسم اعظم سے ماخوذ ہیں جن میں زبردست تخلیقی صلاحیت پائی جاتی ہے۔ المغیرہ بن سعید جنھیں تاریخی مصادر میں الباقرؒ کے غلاۃ کی حیثیت سے دیکھا گیا ہے اور جنھوں نے اسمٰعیلی تصور حیات کی تشکیل میں اہم رول انجام دیا ہے غالباً وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے حروف کی سرّی معنویت پر کلام کیا۔ جلد ہی ابتدائی غلاۃ کے حلقے میں عربی زبان کے اٹھائیس

حروف کے سلسلے میں ان کے خواص اوراثرات پر گفتگو ہونے لگی۔[۳۳۵] عہد فاطمی میں ابوحاتم الرازی اورابو یعقوب السجستانی جیسے اسمٰعیلی داعیوں نے کن فیکون کے تخلیقی فلسفے کو مزید ترقی دی۔ یہ خیال عام ہوا کہ کاف (ک) اورنون (ن) کے دوحرفوں سے کائنات کی تخلیق اس طرح ہوئی کہ کن سے پہلے کونی وجود میں آیا اور پھر اس کی تخلیقی قوتوں نے قدر کو پیدا کیا۔ اس طرح کونی قدر سے الحروف العلویئہ کی تخلیق ہوئی۔ یہ سات حروف علوئیہ سات ناطق پیغمبروں کو ظاہر کرتے ہیں۔ ان ہی حرفوں سے عربی زبان کے دوسرے حروف تہجی پیدا ہوئے۔[۳۳۶] حروف کی یہ اسمٰعیلی تاویل جو کائنات میں اسمٰعیلی اماموں کے مرکزی مقام پر دلیل لاتی تھی، آٹھویں صدی ہجری میں فضل اللہ استرآبادی کے ہاتھوں ایک پیچیدہ مگر سحر کن فن میں متشکل ہوئی۔ فضل اللہ کی حرفی تحریک نے بڑی شدّ ومد کے ساتھ حروف کے سرّی معنیٰ اوران کے خواص کا پروپیگنڈہ کیا۔ دیکھتے دیکھتے مختلف صوفی سلسلوں نے ان خیالات کو قبول کرلیا۔ دسویں صدی ہجری کے آخر تک حروفیہ اورنقطویہ تحریکوں نے اتنی قوت حاصل کرلی کہ صفوی حکمرانوں کو ان کے خلاف سخت کارروائی کرنی پڑی۔[۳۳۷]

اہل صفا کے لبادے میں اسمٰعیلی داعیوں کی چلت پھرت ان کے لیے نظری اور سیاسی ہر دو اعتبار سے غیر معمولی اور حیران کن کامیابی پر منتج ہوئی۔ منگول حملوں کے بعد جب اسمٰعیلی داعیوں نے تصوف کو باقاعدہ طرق وسلسلہ کی بنیاد پر منظّم کرنے کی ضرورت محسوس کی تو انھیں کسی نظری یا عملی دشواریوں کا سامنا نہ کرنا پڑا کہ تصوّف ان کے داعیان مستور کا فطری تنظیمی قالب چلا آتا تھا۔ عہد فاطمی میں ابواسحاق شامی کا صوفی کے بھیس میں افغانستان کے دور دراز علاقوں تک آنا، اہل صفا کے قافلوں کا سندھ و پنجاب کے علاقوں میں ورود اور پھر ملتان ومنصورہ میں فاطمی ولایت کا قیام صوفی قالب کا ہی مرہونِ منت تھا۔ قلعہ الموت کے نزاری اماموں کے عہد میں بدخشاں میں اسمٰعیلی ولایت کا قیام صوفی پیر سید شاہ ملنگ اور سید شاہ خاموش کے ہاتھوں ہی انجام پایا تھا۔[۳۳۸] پیروں اور میروں کی یہ چھوٹی سی ریاست جو پندرہویں صدی کے وسط تک قائم رہی نزاری اماموں کے صوفیانہ مشن کے درپردہ عزائم سے بہت کچھ پردہ اٹھاتی ہے۔ صفوی حکمرانوں کی زبردست مخالفت کے سبب حروفیہ اور نقطویہ تحریک بظاہر ایران سے غائب ہوگئی لیکن ان خیالات نے تصوف کے تقریباً تمام ہی سلسلوں کو کم وبیش متاثر کیا۔ بیشتر صوفی سلسلے بظاہر تو خود کو سنّی شافعی مسلک کا حامل بتاتے لیکن نظری اعتبار سے وہ علیؓ کی ولایۃ، اہل بیت کی فضیلت، ظاہر و باطن، شریعت وحقیقت کی اصطلاح میں کلام کرتے اور نجات وہدایت کے لیے پیر کی رہنمائی کو شرطِ ایمان بتاتے۔ اس طرح تصوف کے بھیس میں اسمٰعیلی دعوت مختلف قالب بدلتی رہی حتیٰ کہ جب ضرورت محسوس ہوئی صوفیاء نے اپنے پرانے قالب کو خیر باد کہہ دینے میں بھی کسی ادنیٰ تکلف کا مظاہرہ نہ کیا۔ مثال کے طور پر صفوی سلسلہ کو لیجیے جسے سنّی شافعی شناخت کے ساتھ شیخ صفی الدین (متوفی ۷۳۵ھ) نے قائم کیا تھا۔[۳۳۹] ایران میں صفوی حکومت کے قیام کے بعد اچانک اس کی شیعہ شناخت سامنے آگئی۔ البتہ شاہ اسمٰعیل نے

اسمٰعیلی کے بجائے بوجوہ اثناعشری شیعیت کو ریاست کا مذہب بنانے کا اعلان کیا۔ اسمٰعیلی داعی اگر اہلِ صفا کے بھیس میں سرگرم نہ ہوتے تو نہ تو شہاب الدین سہروردی شیخ مقتول کہلاتے اور نہ ہی حلاج کا نعرۂ انا الحق صلاح الدین ایوبی کو ان کے قتل پر آمادہ کرتا۔[۳۴۰]

صوفیاء کے یہ حلقے جو بظاہر درویش اور قلندر کی حیثیت سے خود کو پیش کرتے بباطن سیاسی عزائم کے لیے سرگرم رہتے تھے۔ لہٰذا عراق و فارس کے ان علاقوں میں جہاں ان سلسلوں کی پرورش و پرداخت ہوتی رہی تھی صوفیاء کے یہ حلقے حالات کی سازگاری کے ساتھ ہی مجاہدانہ اولوالعزمی کے جوہر دکھاتے۔ بدخشاں میں پیر و میر کی سلطنت کا تذکرہ ہم کر چکے ہیں۔ اس سلسلے کی ایک روشن مثال خود صفوی سلسلہ ہے جسے اسلامی تاریخ میں پہلی بار ایک قومی فارسی ریاست کے قیام کا اعزاز حاصل ہے۔ ابتداء میں صفوی تحریک پر صوفیائے بے سیف کا رنگ غالب تھا لیکن اس سلسلے کے چوتھے صوفی شیخ جنید کی قیادت میں قزلباشوں کی ترک تازیاں بالآخر صفوی امپائر کے قیام پر منتج ہوئی۔ لہٰذا یہ سمجھنا صحیح نہیں کہ صوفیاء صرف حق وہو کی صداؤں سے میدان سر کیا کرتے تھے ہاں ایسا باور کرانا ان کے لیے ایک ناگزیر اسٹریٹجی کا حصہ تھا۔

نزاری امام مستنصر باللہ ثانی انجدان کے علاقے میں شاہ قلندر کے نام سے روپوش رہے البتہ انھوں نے اپنے فاطمی سادات ہونے یا نجات کے لیے پیر و مرشد کا ہاتھ تھامنے جیسے خیالات کا برملا اظہار کیا۔ اس کا ایک سبب تو یہ تھا کہ اب یہ خیالات اپنی عوامی مقبولیت کے سبب صرف اسمٰعیلی داعیوں کی میراث نہیں سمجھے جاتے تھے اور دوسری وجہ یہ تھی کہ مستنصر کی پندیاتِ جوانمردی جن دور دراز علاقوں کے متبعین کو خطاب کرتی تھی وہاں تنظیم کا صوفیانہ قالب ہی کارگر ہو سکتا تھا۔ سو شاہ قلندر نے اپنے آپ کو اہل حق اور اہل حقیقت کہنے پر اکتفا کیا۔ البتہ امام کی اتباع، اس کے دیدار اور حق امام کی ادائیگی پر اصرار باقی رکھا۔[۳۴۱] انجدان میں آج بھی شاہ قلندر (امام مستنصر باللہ ثانی) اور شاہ غریب (امام مستنصر باللہ ثالث) کے مزارات اس خیال کی دلیل ہیں[۳۴۲] کہ ملنگوں اور قلندروں کی مختلف درگاہیں جو برصغیر ہند و پاک میں مرجع خلائق بنی ہوئی ہیں ان کا تعلق کہیں نہ کہیں اسمٰعیلی دعوت سے پایا جاتا ہے۔ منگول حملوں کے بعد اسمٰعیلی ائمہ اور داعیوں نے پیر کی اصطلاح اپنے لیے مخصوص کر لی تھی۔ مثال کے طور پر پیر صدرالدین جو امام اسلام شاہ کی خدمت میں ہندوستان سے حق امام کی رقم لے کر پہنچے تھے داعی، ماذن یا مکاسر کے بجائے پیر کے لقب سے ہی جانے جاتے ہیں اور یہی لقب ان کے خلفاء کا بھی رہا ہے۔ صوفی ادب میں جب ہم کسی صاحبِ طریقت کو خرقہ تقسیم کرتے ہوئے دیکھتے ہیں یا جب فریدالدین گنج شکر کی زبان سے یہ مژدہ سننے کو ملتا ہے کہ انھوں نے نظام الدین اولیاء کو ہندوستان کی ولایت بخش دی ہے تو واقفانِ حال جانتے ہیں کہ مشن اہلِ بیت سے والہانہ اور مخلصانہ وابستگی کے سبب اب انھیں تنظیمِ دعوت میں

ایک اہم منصب پر فائز کیا گیا ہے۔ گذشتہ دنوں نظام الدین اولیاء کی درگاہ کی مرمت کے دوران جب ایک باولی سے دریا کی جانب زیر زمین خفیہ راستہ دریافت ہوا[۳۴۳] تو کسی کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی کہ ایک صوفی درویش کو کسی زیر زمین خفیہ راستہ کی کیا حاجت ہوسکتی ہے۔ البتہ آغا خان فاؤنڈیشن، جس کی ایماء پر حکومتِ ہند کے تعاون سے یہ کام انجام پا رہا تھا، کو شاید اس بات کا اندازہ ہو کہ وہ دراصل اپنے بزرگوں کی قبروں کی نگہبانی کا روایتی فریضہ انجام دے رہا ہے۔

خلاصۂ بحث

فاطمی دعوت دراصل عوامی بے چینی اور سیاسی گھٹن کی پیداوار تھی۔ عامۃ الناس کے لیے اس خیال میں غیر معمولی کشش پائی جاتی تھی کہ سیاسی اور سماجی زندگی کا انحراف امامِ عادل کی عدم موجودگی کے سبب ہے اور یہ کہ خلافت کے واقعی سزاوار آلِ فاطمہؓ کے منصوص ائمہ ہیں جن کی قیادت میں دنیا ایک بار پھر حقیقی اسلام کی برکتوں سے لطف اندوز ہو سکتی ہے۔ آلِ رسولؐ اور آلِ فاطمہؓ کی قیادت کا یہ سیاسی پروپیگنڈہ مذہب اور فلسفہ کی زبان میں کچھ اس منظّم، ولولہ انگیز مگر خاموش انداز سے آگے بڑھا کہ دیکھتے دیکھتے نصف صدی کے اندر فاطمی خلافت کا ابتدائی قالب شمالی افریقہ کی سرزمین پر طلوع ہو گیا۔ اس میں شبہ نہیں کہ الدعوۃ الھادیہ کے نقباء کو اس حیرت انگیز اور سریع کامیابی میں آلِ بیت کے لیے پائی جانے والی عوامی ہمدردی سے خاصا تعاون ملا۔ غلاۃ شیعوں اور محبان آلِ بیت کے علاوہ خود دعوتِ عباسیہ کے شیعی لب ولہجہ نے کسی ایسی تحریک کی کامیابی کے لیے سازگار ماحول فراہم کر رکھا تھا۔ ان حالات میں آلِ فاطمہؓ کے نسلی امامت کے فلسفہ پر ایمان لے آنا اور اس کے لیے غیر معمولی قربانیوں کے مظاہر پیش کرنا عین فطری تھا۔ فاطمی داعیوں نے اپنے سیاسی موقف کو عقیدے کے طور پر کچھ اس طرح پیش کیا کہ فاطمی امام کی اتباع کے بغیر دین کا تصور ناقص معلوم ہونے لگا۔ یہ خیال تو اثنا عشری شیعوں کے ہاں بھی پایا جاتا تھا کہ غدیرخم کا واقعہ تنصیب ولایۃ علیؓ کی حتمی دلیل ہے۔ البتہ فاطمی داعیوں نے امام کو معصوم و مامور قرار دینے یا چار درجہ نبی سے افضل بتانے کے علاوہ امام کے مادۂ تخلیق کو عام انسانوں سے مختلف بتایا۔[۳۴۴] اسمٰعیلی کونیات میں امام کو مرکزی مقام عطا کرنے یعنی صاحب جثہ ابدائیہ سے لے کر ساتویں ناطق محمد بن اسمٰعیل کے ظہور کی تشریح وتاویل نے امامت پر فاطمی ائمہ کے آسمانی حق کو مستحکم کر دیا۔ اس طرح مذہب وفلسفہ کی زبان میں ہونے والے اس در پردہ پروپیگنڈے نے دیکھتے دیکھتے عالم اسلام کو کچھ اس طرح اپنی لپیٹ میں لے لیا کہ چوتھی صدی کے آخر تک مسلم دنیا بجز چند چھوٹی ریاستوں کے سیادت آلِ بیت کے نام لیواؤں کے ہاتھ میں آ گئی۔ شمالی افریقہ مصر وشام اور کسی حد تک حجاز فاطمیوں کے قبضے میں آ گیا۔ بغداد پر دیلمیوں کا تسلط ہوا، بغداد کی

عالمِ اسلام کے عین قلب میں متبعین محمدؐ کا نظری انتشار

شیعہ سنی خلفشار

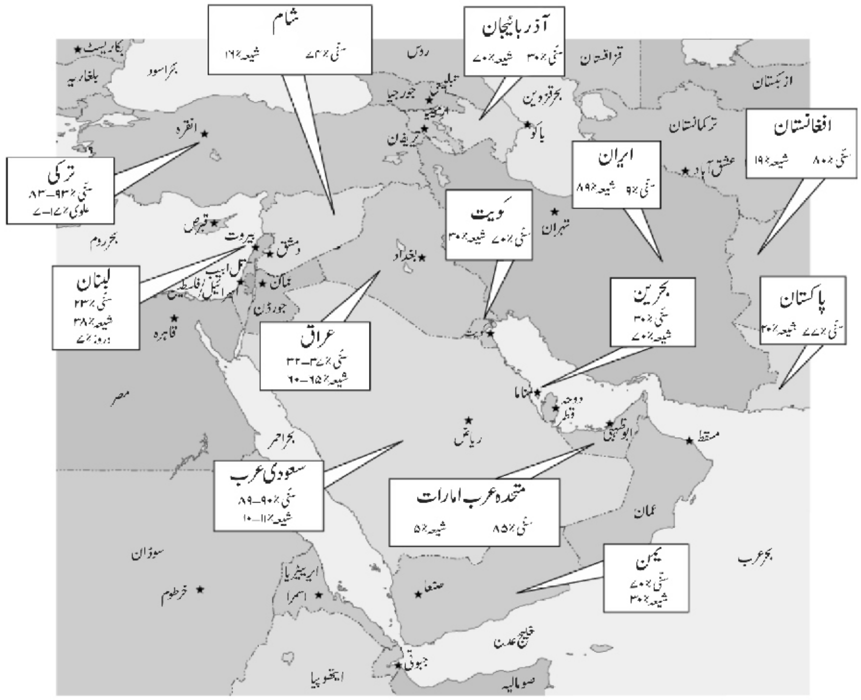

ماخذ: CRS Report for Congress (RS21745)

مسجدوں میں ان کے نام کا خطبہ پڑھا جانے لگا۔ فارس، مکران، بلوچستان جیسے علاقوں میں تو ان کی خودمختار ریاستیں قائم ہوگئیں۔ بحرین، نجد اور شام کے بعض علاقے قرامطہ کے قبضے میں تھے، حجاز پر قرامطہ اور فاطمی دعویداروں کی چپقلش جاری رہتی۔ اِدھر ہندوستان کے ملتان و منصورہ میں فاطمی خلفاء کا خطبہ پڑھا جاتا۔ ماوراء النہر کی کمزور سنّی حکومت اور بغداد میں سنّی خلیفۂ مجبور کی موجودگی کے علاوہ سنّیوں کے پاس گذشتہ سیاسی جاہ وحشم کی کوئی علامت نہ رہ گئی تھی۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو آلِ بیت کے حوالے سے فروغ پانے والے اس سیاسی پروپیگنڈے میں بڑی قوت تھی جس نے مختلف بلاد و امصار میں مختلف عناوین سے محبانِ آلِ بیت کی حکومت قائم کر دی تھی۔ لیکن یہی نسلی پروپیگنڈہ اپنے اندر خود اپنی نفی (antidote) کا سامان بھی رکھتا تھا۔ نسلی امامت کے اسی منصوص تصور نے فاطمی خلافت کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ نزار کی امامتِ منصوص اس کے چھوٹے بھائی مستعلی کے لیے قابلِ قبول نہ ہوسکی۔ نزار حصولِ سلطنت کی فوجی مہم میں مارے گئے اور پھر یہاں سے قیادت کی تقسیم نے نظری طور پر اسمٰعیلی دعوت کو دو حصّوں میں تقسیم کر دیا۔ حسن بن صباح کی دعوۃ الجدیدۃ مختلف قالب بدلتی ہوئی قاسم شاہی اماموں کے موجودہ آغا خانی سلسلے میں جلوہ گر ہوئی۔ دوسری

طرف مستعلی حافظی سلسلوں کے باقیات داؤدی سلیمانی حلقوں کی شکل میں آج بھی موجود ہیں۔ قاہرہ اورالموت کے سقوط کے بعد فاطمی دعوت تنظیمی اورنظری ہر دو اعتبار سے مختلف تغیرات سے گزری ہے۔ کبھی ائمہ کا باہمی اختلاف متبعین کی گروہی تقسیم کا سبب بنا ہے تو کبھی داعیوں کے باہمی جھگڑے مزید چھوٹے چھوٹے فرقوں میں ان کی تقسیم کا باعث ہوئے ہیں۔ اگر امامت واقعی شرط ایمان ہے اور اگر یہ بات سچ ہے کہ امام یا اس کے داعی کے ہاتھوں پر بیعت کے بغیر ایمان مکمل نہیں ہوتا تو اب غیابِ امام میں داؤدی سلیمانی بوہروں کے پاس تکمیل ایمان کا کوئی ذریعہ نہیں رہ گیا ہے۔ دوسری طرف نزاری امام حاضر جو دعوت جدیدۃ کا تسلسل سمجھے جاتے ہیں ان کے نظری خیمے میں تاریخ کے مختلف ادوار میں اتنے بھونچال آئے ہیں کہ اب اس دعوت پر الدعوۃ الھادیہ کا گمان کرنا بھی مشکل ہے۔ حسن علیٰ ذکرہٖ السلام کی اصلاحات سے لے کر موجودہ حاضر امام کا نمازوں کو از سرِ نو رائج کرنے کا پروگرام اس بات پر دال ہے کہ امام کی ذات کو شرع سے بالاتر سمجھنے کا خیال بالآخر اسمٰعیلی متبعین کو ایک ایسی اندھی گلی میں لے آیا ہے جہاں آگے راستہ مسدود ہے۔ موروثی امامت کے فلسفہ نے نہ صرف یہ کہ فاطمی دعوت کو مسلسل تقسیم در تقسیم کے عمل سے دوچار کئے رکھا ہے بلکہ اب امام اور داعیوں کی ساری توجہ اپنی بھیڑوں کو اکٹھا رکھنے میں صرف ہو رہی ہے۔ جن لوگوں نے قرن اوّل کے سیاسی اختلاف سے متوحش ہو کر جمہوری یا شورائی طرزِ انتخاب کے بجائے موروثی امامت کا ہیکل تشکیل دیا تھا اور جو یہ سمجھتے تھے کہ آلِ فاطمہؓ کے خانوادے میں منصوص وموروث امامت کی تنصیب اتحاد و اتفاق کی ضمانت ہوگی، عہد اوّل کا اتحاد و اتفاق لوٹ آئے گا، وہ اس حقیقت کا ادراک نہ کر سکے کہ نسلی امامت نہ صرف یہ کہ اسلام کی بنیادی تعلیمات اور اس کے مزاج سے مغائر ہے بلکہ یہ اپنے اندرون میں تقسیم در تقسیم اور فرقہ در فرقہ کے تباہ کن جراثیم بھی رکھتی ہے۔

حیرت ہوتی ہے کہ جو لوگ اموی اور عباسی طرزِ حکمرانی سے کبیدہ خاطر ہو کر امام آلِ بیت کی قیادت میں احیائے اسلام کی دعوت لے کر اٹھے تھے اور جو لوگ اپنی دعوت کو کبھی الدعوۃ الھادیہ سے موسوم کرتے تھے وہ آج فرقہ پرستی کے شرک میں مبتلا مختلف داعیوں اور اماموں کی چراگاہ بن کر رہ گئے ہیں۔ نظری پراگندگی کا یہ حال ہے کہ اگر سلیمانی فرقہ خود کو قائم القیامۃ کے دور میں سمجھتا ہے تو داؤدی کسی ایسے دور کی شروعات سے بھی انکاری ہے۔ داؤدی بوہروں کا ایک فرقہ اگر داعی بدرالدین (متوفی ۱۲۵۶ھ) کے بعد نص کا قائل نہیں تو دوسرا یہ کہتا ہے کہ خدا نے ہمارے گناہوں کی وجہ سے نص کی نعمت ہم سے چھین لی ہے۔ نظری تشتت کی اس فضا میں دعوتِ ہادیہ کی از سرِ نو منصوبہ بندی تو کجا داعیوں کی تمام توجہ اب اس بات پر مرکوز ہے کہ اس فرقہ گری کو فی زمانہ کس طرح برقرار رکھا جائے۔ خُمس، زکوٰۃ، حق النفس اور سلام کی رقموں کی وصولیابی کا بہتر اور مؤثر انتظام کیسے ہو۔ بعض حلقوں نے تو فرائض وواجبات میں کوتاہی کے ازالے کے طور پر امام کی طرف سے مختلف مدوں میں مختلف رقموں کی جدول بھی مرتب کر لی ہے تا کہ غیاب خلافت اور غیاب امامت میں

بھی مومنین مکمل دینی زندگی کا لطف لے سکیں۔

فاطمی دعوت جب تک مستور رہی یہ اندازہ کرنا مشکل تھا کہ آلِ فاطمہؑ کی امامت کو برحق ثابت کرنے کے لیے جو مختلف اور متضاد باتیں کہی جا رہی ہیں اس میں مخالفین کا پروپیگنڈہ کتنا ہے اور خود داعیوں کا مقصود و مطلوب کیا ہے۔ خلافت فاطمیہ کے ظہور کے بعد توقع تھی کہ نظری اور فکری امور پر کھلے عام مکالمے کی ضرورت محسوس کی جائے گی۔ قاضی النعمان کی دعائم الاسلام میں کسی حد تک ایک معتدل اور مقبول عام منشور کی تشکیل کی کوشش بھی کی گئی۔ البتہ ابتداء ہی سے فاطمی خلافت خود کو جس چہار اطرافی حملے کی زد میں پاتی تھی اس کی وجہ سے نظری انتہا پسندی اور غلو کو لگام دینا تو کجا اسے خاموش تحسین کا سزاوار سمجھا گیا۔ فاطمی خلافت کو بیک وقت اثنا عشری شیعوں، بغداد کے عباسیوں، اندلس کے امویوں اور صلیبی طالع آزماؤں کی مخاصمت کا سامنا تھا۔ ایسی صورت میں غلاۃ شیعہ کے خلاف کوئی بڑی کاروائی نہ تو عملی طور پر ممکن تھی اور نہ ہی سیاسی مصلحت اس بات کی اجازت دیتی تھیں۔ پھر خلیفہ مہدی کے لیے اس کے علاوہ اور کوئی چارا نہ تھا کہ وہ ایسے لوگوں سے تعرض نہ کرے جو ان کے مستقر کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے اور کہتے کہ میں ایسی ہستی کی عبادت نہیں کرتا جو دکھائی نہ دے یا ان سے یہ کہتا کہ یا مولانا آپ آسمان کی طرف چڑھ جایئے کب تک گلیوں میں گھومتے رہیں گے۔[۳۴۵] اس میں شبہ نہیں کہ غلو کے یہ مظاہر پایۂ امامت کو استحکام بخشتے۔ فاطمی ائمہ کو عام گوشت پوست کے انسان سے ماوراء سمجھنا ان کے لیے سجدۂ تعظیمی کی راہ ہموار کرتا۔ لیکن سیاست کے لیے غلو کے یہ مظاہر جتنے کارآمد تھے مذہب کے لیے اتنے ہی مضر بلکہ تباہ کن۔ غلو کی یہ لے بالآخر اتنی بلند ہوئی کہ حاکم کے عہد میں بعض داعیوں نے اس خیال کا پروپیگنڈہ شروع کر دیا کہ مولانا حاکم کے اندر خدا حلول کر آیا ہے۔ انھوں نے اپنے رقعوں کی لوح پر بسم اللہ الحاکم الرحمٰن الرحیم لکھنے کی جسارت بھی کر ڈالی۔[۳۴۶] اب تک اسمٰعیلی حلقوں میں ظاہری شریعت کی تعطیل موضوعِ گفتگو تھی اب دروزیوں نے باطنی شریعت کی قید بھی اٹھا دی۔ دروزی اس التباسِ فکری کی واحد مثال نہیں ہاں وہ کرۂ ارض پر آج بھی اپنی موجودگی کے باعث سب سے روشن مثال ہیں۔ ورنہ ذاتِ امامت میں غلو اور امام کو شرع سے بالاتر قرار دینے کے نتیجے میں مختلف دور میں اس قدر فرقے پیدا ہوئے کہ ان کا واقعی احاطہ مشکل ہے۔

نسب فاطمہؑ کا حوالہ جو سیاسی پروپیگنڈے میں فاطمین کی صلابت فکری کی دلیل سمجھا جاتا تھا، قیام حکومت کے بعد اس کی حیثیت محض سیاسی چہرے کی ہو کر رہ گئی۔ ظہورِ خلافت کے کوئی سو سال بعد عید فاطمہؑ کے سماجی مظاہر کی ضرورت اس لیے محسوس ہوئی کہ فاطمی خلافت جو اپنی سیاست اور فقہی مسلک میں سنّی عباسیوں اور اثنا عشری شیعوں سے مختلف نہ تھی،[۳۴۷] اپنے تفوق کو ایک نئی شناخت عطا کر سکے۔ اذان میں حیّ علیٰ خیر العمل کی شمولیت اور خطبہ میں آلِ فاطمہؑ پر صلوٰۃ و سلام کا اضافہ فاطمی اسلام کے ایک منفرد قالب کی تشکیل کی کوشش تھی۔ آنے والی صدیوں میں مختلف بلادو

امصار کی مسجدیں سیدۃ النساء اھل الجنۃ کی صداؤں سے گونجنے لگیں۔ایک نئے اور مختلف قالب کا یہ شوق بالآخر ایک طرح کی مسلکی تنگ نظری کا باعث بنا۔کہتے ہیں کہ حاکم کے عہد میں ایک آدمی کو صرف اس لیے قتل کر دیا گیا کہ وہ کہتا تھا کہ میں حضرت علیؓ کو نہیں جانتا۔اس کے دور میں بعض لوگ صرف اس جرم میں گرفتار کر لیے گئے کہ انھوں نے صلوٰۃ الضحیٰ پڑھی تھی۔تراویح چونکہ اہل سنت کا شعار تھا اس لیے اس کا قیام ممنوع قرار دیا گیا اور اہل سنّت سے اس بات کا مطالبہ کیا گیا کہ وہ اپنے گھروں پر رنگین اور منقش تحریروں میں سب السلف لکھوائیں۔[۳۴۸] حتیٰ کہ ان سبزیوں اور پودوں کے استعمال سے بھی روک دیا گیا جن کے بارے میں یہ خیال تھا کہ وہ مخالفین کی پسندیدہ غذا رہی ہیں۔خیال کیا جاتا تھا کہ جرجیر کا پودا حضرت عائشہؓ کو محبوب تھا، متوکلیہ عباسی خلیفہ متوکل کی طرف منسوب کی جاتی تھی اور ملوخیہ امیر معاویہؓ کی پسندیدہ سبزی تھی سو ۳۹۳ھ میں حاکم نے ان تینوں کے استعمال پر حکم امتناعی جاری کر دیا۔[۳۴۹] خلیفہ ظاہر نے ۴۲۶ھ میں دعائم الاسلام کو اسلام کے واحد مستند فقہی مسلک کے طور پر رائج کرنے کی کوشش کی۔تمام مالکی فقہاء ملک سے نکال دیئے گئے۔[۳۵۰] خلیفہ عزیز کے زمانے میں فقہ کی دوسری کتابوں کا رکھنا باعث تعزیر قرار پایا۔جس کے پاس مؤطا کا کوئی نسخہ پایا جاتا اسے سخت سزا دی جاتی۔[۳۵۱] دین کے اسمٰعیلی قالب پر جوں جوں اصرار بڑھتا گیا الدعوۃ الھادیہ کے نقیب اپنے ہی تعمیر کردہ نظری گنبد میں محصور ہو کر رہ گئے۔

سیادت جب مذہب کے قالب میں جلوہ گر ہوتی ہے تو یہ ایک ناقابل تسخیر قوت ثابت ہوتی ہے۔آلِ بیت کے آسمانی حق کے پروپیگنڈے نے ابتدائی صدیوں میں عالم اسلام کو مسلسل اتھل پتھل سے دوچار کئے رکھا۔اموی حکومت کی بساط اسی پروپیگنڈے کے سہارے لپیٹی گئی۔عباسی خلافت اسی پروپیگنڈے کی رہینِ منت تھی۔فاطمی حکمرانی کے خاتمہ کے بعد بھی یہ نظریہ خلفائے باطن اور سیادتِ سادات کے مختلف روحانی قالب بدلتا رہا۔سیاست بمعنیٰ حصولِ اقتدار جب اساسی دینی لفظیات میں جلوہ گر ہوتی ہے تو آگے چل کر اظہار کے یہی قالب اس کے پاؤں کے زنجیر بھی بن جاتے ہیں۔سیاسی نظریہ بدلتے حالات کے زیر اثر نئی حکمتِ عملی کا متقاضی ہوتا ہے جب کہ مذہبی لفظیات اس میں کسی بڑی تبدیلی کی گنجائش نہیں پاتی۔مصلحین کی تمام کوششیں اسی نظری گنبدِ محبوس کے اندر چلت پھرت سے عبارت ہوتی ہیں جن پر بظاہر تو انقلابی تبدیلیوں کا گمان ہوتا ہے لیکن فی الواقع ان کی حیثیت ایک لایعنی گردشِ محوری سے زیادہ نہیں ہوتی۔قاضی النعمان کی معتدل فکری، نزاری قلعۂ الموت میں عیدِ قیامت کی تقریبات[۳۵۲] اور حسن ثالث کے عہد میں سنّی اسلام سے قربت کی خواہش دراصل اسی گنبدِ محبوس سے نکلنے کی ناکام کوششیں تھیں۔جس عمارت کی بنیاد ہی ٹیڑھی ہو اسے منہدم کئے بغیر اصلاحِ احوال کی کوئی کوشش کارگر نہیں ہو سکتی۔لیکن مصیبت یہ تھی کہ سیاسی نظریوں نے مذہبی معتقدات کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔دین کا یہ اسمٰعیلی قالب، سنّی، اثنا عشری یا اباضی قالب کی اصلاح کے بجائے ایک

فریق کی حیثیت سے مسلسل مزاحم ہوتا رہا۔ مسلمانوں کے نظری اور سیاسی انتشار پر تاریخ کا اس سے بڑا طنز اور کیا ہو سکتا ہے کہ ہلاکو جب قلعۂ الموت کی اینٹ سے اینٹ بجانے کو چلا ہے تو اسے سنّی عالم اور مورّخ علاء الدین عطا ملک جوینی کی رہنمائی حاصل تھی اور جب بغداد میں خلافتِ عباسی کی بساط لپیٹی گئی ہے تو اس مہم میں منگولوں کو عظیم المرتبت شیعہ عالم نصیر الدین طوسی کی ترغیب و تائید حاصل تھی۔

فاطمی خلافت قصۂ پارینہ بن گئی البتہ سیاسی پروپیگنڈے نے دین کا جو فاطمی قالب تشکیل دیا تھا وہ مختلف سطحوں پر مسلم ذہن سے مسلسل مزاحم ہوتا رہا۔ وصایتِ علیؓ یا خلیفہ بلافصل کا عقیدہ تو جمہور عوام میں مقبول نہ ہو سکا اور نہ ہی حضرت علیؓ کو نفس اللہ، معبود الملائکہ اور غافر خطیۃ الرسول سمجھنے والے لوگ آج بڑی تعداد میں پائے جاتے ہیں البتہ تفضیل علیؓ کے چرچے عام ہیں اور پنجتن کو اسلام کی آسمانی شاہی فیملی کی حیثیت حاصل ہے۔ اسمٰعیلی داعی اہل صفا کے لبادے میں جس طرح اکنافِ عالم میں عوامی سطح پر سرگرم رہے اور جس طرح مختلف خطرات و مصائب میں انھوں نے دعوت کا فریضہ انجام دیا، جمہور عوام کے لیے اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ ان کے التباساتِ فکری کو اسلام کے فطری قالب پر محمول کریں۔ فاطمی خلافت مضمحل اور منتشر ہو گئی البتہ اس پروپیگنڈے نے ہمیشہ ہمیش کے لیے سادات کی روحانی سیادت اور سماجی عظمت پر دلیل قائم کر دی۔ یہ خیال عام ہوا کہ حسنی حسینی سید کی تعظیم ہر حال میں واجب ہے خواہ وہ زنا کا ارتکاب کرے یا عملِ قومِ لوط میں مبتلا ہو، شراب پیئے، دجل و فریب کرے یا سود کھائے، چوری کرے یا جھوٹ بولے یتیموں کا مال ہڑپ کر جائے یا پاکدامن عورتوں پر تہمت لگائے یا بغیر کسی وجہ کے مومن مردوں اور عورتوں کو اذیت دے۔[۳۵۳] سادات کو یہ کھلی چھوٹ شاید اس وجہ سے حاصل ہو گئی تھی کہ بعض روایتیں صراحت کے ساتھ بتاتی تھیں کہ فاطمہؓ نے چونکہ اپنی شرم گاہ کی حفاظت کی ہے سو اللہ تعالیٰ نے ان پر اور ان کی ذرّیت پر آگ حرام کر دی ہے۔[۳۵۴] اس طرح روایتوں کے سہارے شروع ہونے والا سیاسی پروپیگنڈہ جو ابتدأ فاطمی خلفاء کے استحقاقِ خلافت پر دلیل لاتا تھا بالآخر سادات کی نسلی مشائخیت پر منتج ہوا۔ ظاہر و باطن کی تاویل جو کبھی فاطمی داعیوں کی التباسِ فکری کا علامیہ تھی عام تعبیری ادب کا مزاج بن گئی۔ قرآن جو کبھی اکتشافی ذہن کا غلغلہ انگیز آسمانی منشور سمجھا جاتا تھا ایک سرّی کتاب کی حیثیت اختیار کر گیا جس کے اسرار و رموز کی پیچیدگیاں صرف علم لدنّی کے علوی سلسلے کے حاملین پر منکشف ہوتی تھیں، عوام کالانعام کے لیے قوارع القرآن، مجرّبات، آیتوں کے خواص اور طلسماتی انداز کے وفق و نقوش کافی سمجھے گئے۔ شاہ ولی اللہ جیسے راسخ العقیدہ عالم اس التباسِ فکری میں مبتلا رہے کہ رسولؐ اللہ کے ورثاء میں جن لوگوں نے حکمت، عصمت اور باطنی قطبیت کا حصّہ پایا وہ اہل بیت ہیں جو خاصانِ خاص میں سے ہیں۔ بقول شاہ ولی اللہ فوارثه الذین اخذ والحکمة والعصمه والقطبية الباطنية هم اهل بيته و خاصته[۳۵۵] علی کی وصایت اور محدَّث کی حیثیت سے ان

پر فرشتوں کے نزول کی بات تو شیعہ حلقوں تک ہی محدود رہی البتہ اہل تصوف کی پرزور تبلیغ اور شطحیات پر مبنی پروپگنڈے نے مفہم کے حوالے سے آسمانی رابطے کا دروازہ کچھ اس طرح کھولا کہ عبدالقادر جیلانی سے لے کر شاہ ولی اللہ تک اور عبدالبہا سے لے کر طاہر القادری تک[۳۵۶] اِلھمنی ربی اور أمرنی مصطفیٰ کی بازگشت آج بھی مسلسل سنائی دے رہی ہے۔